ایمان کے بعد

اہم ترین فرضِ عین

حملہ آور دشمن کے خلاف دفاعی جہاد
اور مقبوضہ مسلم سرزمینوں کی بازیابی

عبداللہ عزام شہیدؒ

مبشرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایمان کے بعد

اہم ترین فرضِ عین

حملہ آور دشمن کے خلاف دفاعی جہاد

اور مقبوضہ مسلم سرزمینوں کی بازیابی

عبداللہ عزام شہیدؒ

حدثنا ابو الیمان اخبرنا شعیب عن الزُّھری حدّثنی سعیدبن المسیب انّ ابا ھریرہ قال سمعت رسول اللہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یقول لم یبق من النّبوۃ الا المبشرات قالوا وما المبشرات قال الرُّؤیا الصّالحۃ

(صحیح البخاری، باب التعبیر، رقم الحدیث: ۶۴۷۵)

حضرت ابوھریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا، آپؐ فرما رہے تھے کہ (میرے بعد) نبوت میں سے بجز مبشرات کے کچھ باقی نہیں رہے گا۔ (صحابہ کرامؓ نے) عرض کیا: (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) مبشرات سے آپ کی کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا: صالح خواب۔

نام کتاب	ایمان کے بعد اہم ترین فرضِ عین حملہ آور دشمن کے خلاف دفاعی جہاد اور مقبوضہ مسلم سرزمینوں کی بازیابی
مصنف	عبداللہ عزام شہیدؒ
ناشر	محمد صہیب قرنی، مبشرات، پوسٹ بکس ۱۲۶، شائیگان، اسلام آباد
اشاعت	اوّل
تاریخِ اشاعت	ذوالحج ۱۴۲۷ھ
قیمت	۷۵ روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی بات ______

امتِ مسلمہ آج اداس ہے، مغموم ہے! غیروں کے ستم کا تو شکوہ ہی بے جا ہے کہ وہ غیر ٹھیرے، لیکن اگر اپنے بھی مرہم رکھنے سے کترانے لگیں تو پھر زخم ہائے جگر کسے دکھائے جائیں؟

مانا کہ ''مبشرات'' کے ذمے ہے کہ قارئین کو امت کے مجد و سربلندی کے خواب دکھائے، ان خوابوں کی تعبیروں کو آپ کے سامنے رکھے! لیکن .... ان سچے خوابوں کی حسین تعبیریں بھی ہر آنکھ سے اپنے حصے کے رتجگے مانگتی ہیں، ہر دل سے موسمِ گل کی زرخیزی کا سامان طلب کرتی ہیں ۔

دل کی کھیتی کو ہے پانی کی ضرورت مقصود

اس قدر اشک بہاؤ کہ ڈبو دو خود کو!

یہ کتابیں جو آپ کے ہاتھوں میں آتی ہیں، لکھنے والوں نے انھیں اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے، درد کے دریا میں ڈوب کر ہی یہ گوہر نکالے جاتے ہیں! پس اس دردِ دل کو آگے سے آگے بانٹیے تاکہ یہ پستہ اذانیں رعدِ بلالی بن جائیں!

شیخ عبداللہ عزام شہیدؒ کی یہ کتاب، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ کے لئے بھی ہے اور آپ کے احباب کے لئے بھی، آپ کے پڑوسیوں اور اقرباء کے لئے بھی، بلکہ ہر مسلمان کے لئے یہ ایک گراں مایہ تحفہ ہے کہ اُنھی کی جانوں، مالوں، عزتوں اور زمینوں کی حفاظت کا سوال ہے جس کا جواب اس میں دیا گیا ہے! اسے پڑھئے، سمجھئے ... یہ خود آپ کو بتائے گی کہ اسے پڑھانا اور سمجھانا کس قدر ضروری ہے!

امتِ مسلمہ آج اداس ہے، مغموم ہے! آیئے اس کی اداسی کے اسباب کو سمجھئے! آیئے اس کے غموں کا ادراک کیجئے! شائد کہ ہم ان کا مداوا بھی کر سکیں!

محمد صہیب قرنی

مبشرات: اسلام آباد

تقریظات

مولانا شیر علی شاہ المدنی

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

مولانا حافظ ساجد انور

فتوے کی تائید میں عالمِ اسلام کے بعض دیگر علماء کی آراء

شیخ القرآن والحدیث مولانا شیر علی شاہ المدنی، استاذ الحدیث بجامعہ دار العلوم الحقانیہ، اکوڑہ خٹک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ و کفی و سلامٌ علی عبادہ الذین اصطفی ،أما بعد:

مترجم موصوف قابلِ صد ستائش وتحسین ہیں کہ انھوں نے لسان الجہاد، مرشد المجاہدین علامہ دکتو عبداللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ کی گراں قدر زریں کتاب ''ایمان کے بعد اہم ترین فرضِ عین دفاعی جہا کا ترجمہ سلیس، شستہ، شگفتہ اردو زبان میں نہایت ہی امانت کے ساتھ محققانہ انداز میں فرما کر ار دان طبقے پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔

جہادِ افغانستان کے عظیم سالار دکتور عبداللہ عزام شہید رحمۃ اللہ علیہ محتاجِ تعارف نہیں ۔تمام عالم اسلام کو پتہ ہے کہ وہ جہادِ افغانستان کے روحِ رواں تھے۔ان کی دینی حمیت و غیرت اور ایمانی جرأت وبسالت سے لبریز ولولہ انگیز خطبات اور تقریروں نے بلادِ عرب وعجم کے فرزندانِ اسلام کے قلوب وارواح میں خوابیدہ جہادی احساسات و جذبات کو للکارا۔عربی جرائد ومجلّات اور اخبارات میں افغانستان کے غیور مسلمانوں پر روسی درندوں کی وحشیانہ یلغار وسربریت کے خلاف دفاعی جہاد کی اہمیت پر جاندار مقالات شائع کیے،مشائخ اور علمائے حجاز اور بلادِ عرب کو افغانستان کے پاکیزہ جہاد کی طرف متوجہ کیا۔شباب وشیوخ سے افغانستان کا میدانِ کارزار بھر دیا۔

اس عظیم جہادی قائد سے میری پہلی ملاقات منیٰ کی مقدس سرزمین میں ہوئی تھی ۔میرے خالہ زاد بھائی مولانا سید محبوب علی شاہ صاحب اردن یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے،وہ مجھے اردنی طلبہ کے ساتھ منیٰ میں ملے ۔انھوں نے مجھے یوم النحر (عید کے دن) نماز عشاء کے بعد دعوت پر بلایا۔ میں مقررہ وقت پر اردنی بعثۃ الحج کے خیمات میں حاضر ہوا۔یونیورسٹی کے پروفیسروں اور طلبہ سے ملاقات ہوئی۔خوش قسمتی سے مرحوم ومغفور دکتور عبد اللہ عزام رحمہ اللہ علیہ اس بعثۃ کے سربرا

تھے۔انھوں نے مجھ سے پاکستان کے علمائے کرام اور مدارس کے بارے میں استفسارات کیے۔میں نے علمائے کرام اور مدارس کے تفصیلی حالات بیان کیے جن سے وہ بہت ہی مسرور ہوئے۔پھر فرمانے لگے کہ علمائے کرام اور رجال الدین کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔چاروں طرف سے دشمنانِ اسلام، اسلامی شعائر، اسلامی تشخص کے مٹانے میں منظم سمجھوتے کے تحت بڑی تیزی سے مصروفِ عمل ہیں۔وہ بہت ہی پرسوز انداز میں مسلمانوں کی حالتِ زار پر حسرت وافسوس کررہے تھے۔پھر چند سالوں کے بعد جب افغانستان میں روسی سامراج کے خلاف علمِ جہاد بلند ہوا تو مرحوم عبداللہ عزام مقدمۃ الجیش کے طور پر صفِ اوّل میں نظر آئے، وہ دن رات الجہاد الجہاد کی شمع پر پروانوں کی طرح جھپٹتے رہے اور بالآخر اپنے لختِ ہائے جگر کے ساتھ شہادتِ عظمیٰ کے اعلیٰ وارفع مقام پر فائز ہوئے۔سقی اللہ ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ.

آخر میں میں ایک بار پھر مترجم موصوف کی اس عظیم جہادی خدمت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کررہا ہوں اور بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوں کہ رب العالمین جل جلالہ موصوف کو اس دینی، مذہبی کاوش کا صلہ دارین میں نصیب فرمادے اور اس کتاب سے اہل اسلام کو استفادہ کی توفیق عطا فرماوے۔

وللہ الحمد اولاً و آخراً وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد و آله و أصحابه أجمعين.

شیر علی شاہ المدنی

استاذ الحدیث بجامعۃ دار العلوم الحقانیہ، اکوڑہ خٹک

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی، استاد جامعہ امداد العلوم، جامع مسجد درویش، پشاور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نبی علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے ((أوتيت جوامع الكلم)) یعنی مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں۔جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سادہ اور مختصر الفاظ میں بہت بڑی بڑی اور دوررس حقیقتوں کو بیان کرنے کا ملکہ عطا فرمایا تھا۔بلاشبہ نبی علیہ السلام کی احادیث جامع الکلامی کا

بہترین نمونہ ہیں۔ اسلام کی وضاحت کرتے ہوئے نبی علیہ السلام نے ایک موقع پر جہاد کے بارے میں '' ذروة سنامه '' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ذروۃ کسی چیز کی بلند ترین چوٹی اور عمدہ حصے کو کہتے ہیں، جس کو حاصل کر کے آدمی اس چیز کی اصل حقیقت اور پوری معنویت کو پا جاتا ہے۔

انسانی تاریخ اور نفسیات کے وسیع اور عمیق مطالعے سے یہ بات دو جمع دو چار کی طرح ایک بدیہی مسلمے کی صورت میں سامنے آتی ہے کہ انسان کسی مقصدِ عزیز کے حصول کے لئے جان کی بازی سب سے آخر میں لگاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مرغوبات کے لئے تو وہ سب کچھ تج دینے پر آمادہ ہوتا ہے لیکن جان کا نذرانہ دینے میں وہ بہت بخیل واقع ہوا ہے۔ زندگی کی قربانی سب سے آخر میں اور فقط اسی مقصد کے لئے وہ پیش کرتا ہے جس سے وہ نہ صرف عقلی بلکہ طبعی طور پر بھی محبت کی انتہا تک پہنچا ہوا ہو۔ کسی بھی چیز سے محبت کا اقرار واعتراف یا دعویٰ کرنے کے بعد اس کی جانچ پرکھ کی بہترین کسوٹی اس پر جان قربان کرنا ہی قرار پاتی ہے۔

نبی علیہ السلام کے جہاد کے بارے میں متذکرہ بالا مختصر الفاظ ((ذروة سنام الإسلام الجهاد في سبيل الله)) اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ اسلام کی اصل حقیقت اور معنویت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے لئے جان کی بازی لگا دینے سے دریغ نہیں کرتے کیونکہ حدیث کی زبان میں جہاد نام ہی جان کی قربانی دینے کا ہے۔ ایک بزرگ فرمارہے تھے کہ مدینہ منورہ میں گو اعتقادی منافقین کی بھی کمی نہ تھی لیکن اکثر و بیشتر منافقین کا تعلق اسی گروہ سے تھا جن کو دین کے غلبے اور سربلندی کے لئے جہاد کا یارانہ تھا۔ سو اسی مشکل نے ان کو منافقت کی مہلک ترین وادی میں دھکیل دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات جس طرح اُس وقت صحیح اور بجا تھی، چودہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی ٹھیک ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر صحیح ہے!

بہت بڑے بڑے روایتی قسم کے دین دار اور صلحِ کل کے علم بردار جہاد کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بڑی ناگفتنی اور دور از کار قسم کی تاویلات سے اس کی اہمیت کم کرنے کے درپے ہیں، قرآن وحدیث کی نصوص اور فقہائے کرام کی تشریحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے خوامخواہ کے لیت ولعل سے اس میں کیڑے نکالتے ہیں۔ خود اپنے حصے کی ذمہ داری ادا نہیں کرتے اور

دوسروں کو بھی اس ذمہ داری کا احساس نہیں کرنے دیتے۔ فإلى الله المشتكى۔

لیکن ان باتوں کے باوجود نامعلوم اللہ تعالیٰ نے اسلام کی فطرت میں کیا عجیب وغریب خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ جب بھی دشمنانِ اسلام کا غلبہ بظاہر ایک حقیقتِ ثابتہ بننے لگتا ہے اور ہر طرف سے تہہ بہ تہہ مایوسیاں چھانے لگتی ہیں تو غیر متوقع طور پر اسلام خود ہی اپنے اندر سے کھینچ کھینچ کر ہر نتیجے سے بے پروا ایسے پر جوش نبرد آزماؤں کو مقابلے کے لئے محاذِ جنگ پر لا کھڑا کرتا ہے جن کے آہنی حوصلے اور عزائم پہاڑوں سے ٹکرا کرانھیں پاش پاش کرنے کے لئے بے تاب و بے قرار ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں یہ واقعہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار پیش آچکا ہے۔ اور آج بھی ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بڑی حیرت واستعجاب سے اس محیر العقول منظر کو اپنے روبرو دیکھ رہے ہیں اور اسلام کی اپنی تاثیر بالخاصیت کے سوا اس کی کوئی اور معقول توجیہ نہیں کر پا رہے ہیں۔

دنیا کی ایک بڑی سمجھی جانے والی قوم روس نے بے سروسامان افغانستان کو لقمۂ تر سمجھ کر بڑے اعتماد اور جوش وخروش سے اس پر حملہ کیا لیکن افغانیوں نے مادیت کے اس سیلاب کو روحانیت کے زور سے روکا، جہاد کا علم اٹھایا اور بالآخر روس اپنے زخم چاٹتا ہوا بھاگ نکلا۔ اس میں شک نہیں کہ روس کی پسپائی اور شکست میں اسلام دشمنوں کی اپنے اغراض کے لئے رفاقت اور پشتی بانی نے بھی اپنا اثر دکھایا لیکن فتح وظفر کا اصل سہرا عرب وعجم کے انھی مجاہدین کے سر ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر پہاڑوں سے ٹکرانا طے کیا اور بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہو کر پہنچے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

انھی عرب مجاہدین کی صفِ اوّل میں ایک بہت ہی معزز، محبوب اور روشن ترین نام عبداللہ عزام شہیدؒ کا ہے جنھوں نے اپنے خلوص، لگن اور جوش وخروش کے ذریعے جہادِ افغانستان کے حوالے سے وہ رتبہ حاصل کیا جس کا عشرِ عشیر بھی کسی مومن کے لئے بہت بڑا تمغہء امتیاز اور مایہء افتخار سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سیف وسنان اور قلم ولسان کے ہر محاذ پر دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور اس سلسلے میں کسی تھکاوٹ اور یاس کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ مرحوم جو ایک مرتبہ افغانستان میں کفر کے خلاف

سرگرمِ عمل ہو گئے تو پھر اسی کے ہو رہے، بالآخر جان کا نذرانہ پیش کیا، شہادت کے رتبۂ عظمیٰ پر فائز ہوئے، اور عاش سعیداً و مات شہیداً کے مصداقِ برحق ٹھہرے۔

ایک طویل عرصے کے بعد روسی سامراج کے خلاف جن لوگوں نے فریضہء جہاد کے احیاء میں بنیادی کردار ادا کیا شہید عبداللہ عزام ان سب میں نمایاں ترین شخصیت کے حامل ہیں۔ شیخ اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء نے اسی تسلسل کو آگے بڑھایا، جس کے زیرِ اثر پوری دنیا میں جہاد کا غلغلہ بلند ہوا۔ معرکہء مین ہیٹن (گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء) کے بعد، کفر نے مسلمانوں پر عرصہء حیات تنگ کرنا شروع کیا تو اسلام کی فطرت نے ایک مرتبہ پھر انگڑائی لی اور مختلف جوانب واطراف سے عشاقِ جہاد نے ''طیراً ابابیل'' کا روح پرور سماں باندھا اور آج حالت یہ ہے کہ کسی نام ونمود اور مفاد سے بے پروا ہزاروں نوجوان مشرق ومغرب سے آ آ کر شہیدی حملوں کے لئے اپنے نام درج کروا رہے ہیں اور خرمنِ کفر کو جلا کر راکھ کر دینے کے لئے بےتاب بجلیوں کی طرح کوند رہے ہیں۔

پوری دنیا میں مسلمانوں کے وسائل اور اقتدار واختیار پر قابض فرماں روا طبقہ عام طور پر کفر کے آلہء کاروں کی صف میں کھڑا ہے، لیکن حلاوتِ ایمانی کی دولت سے مالا مال اور غلبہء دین کے جذبے سے سرشار عامۃ المسلمین دنیا کی ''عالمی طاقت'' ہونے کے دعویدار امریکا کے لئے لوہے کے چنے ثابت ہو رہے ہیں۔ اللھم زد فزد. یہ سب کچھ شہید عبداللہ عزامؒ کے کاشت کردہ تخمِ جہاد کے وہ ثمراتِ شیریں ہیں جن سے دجالیت کے اس گئے گزرے دور میں بھی اہلِ ایمان کے کام ودہن متلذذ ہو رہے ہیں۔

کفر کے خلاف برسرِ پیکار آج کے تمام مجاہدین، عبداللہ عزام شہیدؒ کی روحانی اولاد وذرّیت ہیں، جو اُنھی کی تحریک کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کے لئے رواں دواں ہیں۔ عراق وافغانستان کے یہی مجاہدین ملتِ اسلامیہ کی آنکھ کے تارے ہیں جو پوری ملت کی طرف سے دفاعِ اسلام کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ کفر کے ایوانوں میں انھیں کے رعب ودبدبے سے زلزلہ بپا ہے۔ دشمنوں کے پروپیگنڈے میں آ کر ان کو دہشت گرد قرار دینے والے یا تو حد درجہ سادگی اور جہالت کا شکار ہیں اور یا پھر دنیا کی خاطر آخرت کو برباد کرنے والے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے ان مارہائے آستین سے بہت

احتیاط لازم ہے۔

شیخ عبداللہ عزامؒ شہید کا سارا تحریری کام چار مبسوط جلدوں میں طبع ہوکر بہت پہلے منظرِ عام پر آچکا ہے۔مترجم موصوف نے اسی مواد میں سے، جہاد کے موضوع پر ان کے ایک عربی رسالے کا انتخاب کر کے اسے اردو میں مدون کیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پورے تحریری کام کو اردو میں منتقل کیا جائے کہ اس میں جہادِ افغانستان کی ایمان پرور تفصیلات کے ساتھ ساتھ بہت سے اہم علمی موضوعات پر قرآن وحدیث کی روشنی میں بہت مؤثر تحقیقات سپردِ قلم کی گئی ہیں۔

مترجم، اردوخوانوں کی طرف سے بہت بہت دادو تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جہاد سے متعلق اپنے وقت کے ایک بہت بڑے مجاہد کے خیالات سے لوگوں کو آگاہی بخشی اور اس سلسلے کے بہت سے سوالات وشبہات کے کافی وشافی جوابات سے بہرہ مند کیا۔ فجزاه الله أحسن الجزاء فی الدنیا و الآخرة. آمین .ثم آمین.

الطاف الرحمٰن بنوی

استاد جامعہ امداد العلوم، جامع مسجد درویش، پشاور صدر

مولانا حافظ ساجد انور، مدیر، دارالعلوم تفہیم الاسلام، نوشہرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله و كفى وسلامٌ على عباده الذين اصطفى ،اما بعد:

امام عبداللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب: "**الدفاع عن أراضي المسلمين أهم فروض العيان بعد الإيمان**"... دراصل ان کا وہ فتویٰ ہے، جو اُس وقت دیا گیا تھا جب افغانستان میں روسی افواج در آئی تھیں۔اس فتوے نے سرخ سیلاب کے آگے بند باندھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اللہ اُن کی روح کو راضی کردے کہ یہ آواز اتنی موثر تھی کہ اسے سن کر عرب وعجم نے اپنے جگر گوشے اس جہاد کے سپرد کردیئے۔ان لفظوں کا حق بھی تھا کہ ایسا اثر دکھاتے کہ امام عزامؒ نے اس فتوے کو اپنے

قلم کی سیاہی سے نہیں، خونِ جگر سے لکھا تھا۔ کفر کا عالمگیر شکنجہ یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ یہ قلم یونہی چلتا رہے، زبان فہمِ دین کا قرض چکاتی رہے اور شیخ عزام بابِ خراسان کی چوکھٹ پر کھڑے عالمِ اسلام کے جوانوں کو جوق در جوق یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے دامِ فریب سے نکال کر سربلندی و عروج کے معرکوں میں اتارتے رہیں۔ وہ طاغوتی نظامِ تعلیم جس نے ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کو شاہانہ طرزِ زندگی کا اسیر بنادیا ہے، کپڑے لتّے کا غلام بنا چھوڑا ہے، مغربی کفری تہذیب سے مرعوب کردیا ہے، شیخ نے ایسی ہزاروں، لاکھوں بے سمت جوانیوں کو عظمت و عزیمت کے راستوں پر لگایا، ذلّت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کا درس اور، ابابیلوں کو ہاتھیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دیا۔ نتیجتاً نیل کے ساحل سے کاشغر تک اور مغرب کی وادیوں سے سائبیریا کے برفستانوں تک سے مجاہدین کے گروہ در گروہ اللہ کے راستے میں نکل کھڑے ہوئے۔

یہ سارا منظر عالمی کفری نظام کے لئے ناقابلِ برداشت تھا، چنانچہ ۲۴ نومبر ۱۹۸۹ء کو پشاور کی ایک مصروف شاہراہ پر اَن دیکھے ہاتھوں شیخ کی گاڑی دھماکے سے اڑادی گئی، جانے والے کو وہ خزانہء جاوداں مل گیا جس کے لئے اس نے پہلے اپنی جائے پیدائش ارضِ مقدس فلسطین کو چھوڑا، پھر بطور معلم جامعہ ام القریٰ اور جوارِ کعبہ کی مفارقت کو برداشت کیا، اور پھر آخر میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کو بھی الوداع کہہ دیا کہ ''علم'' کو جس ''عمل'' کی جستجو تھی اس کا درجہ قیل وقال کی دنیا سے بہت بلند تھا۔ یہ جمعہ کا دن تھا جس روز شیخ اپنے دو نوجوان بیٹوں کے ساتھ، لہو سے باوضو ہوکر، اور سرخرو ہوکر اپنے ربّ کے دربار میں پہنچے۔ جانے والے کے جسد سے اٹھتی ہوئی مہک بزبانِ حال کہہ رہی تھی کہ دربارِ الٰہی میں اس لہو کی کیا قیمت ہے؟ آج دنیا میں جہاں بھی اس فریضہء گم گشتہ کی ادائیگی میں مصروف لوگ دیکھے جاتے ہیں تو ان کے کردار و افکار میں اسی لہو کی روشنائی جھلکتی نظر آتی ہے۔

شہیدؒ نے اپنے پیچھے احیائے جہاد پر مبنی ایک عظیم الشان علمی ذخیرہ چھوڑا جو ان کے لئے ان شاءاللہ صدقہء جاریہ رہے گا اور مسلمانوں کی آئندہ نسلیں اس سے علم و حکمت کے موتی چنتی رہیں گی۔ شہید کی یہ تاریخی کتاب بھی اسی انمول ''خزانے'' کا ایک سنہرا ''باب'' ہے۔ اور مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ کتاب عصرِ حاضر کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے کیونکہ اس میں جس مسئلے پر گفتگو کی

گئی ہے وہ اِس زمانے میں مسلمانوں کو درپیش اہم ترین مسئلہ ہے، یعنی مسلم سرزمینوں پر کافر اقوام کی چڑھائی اور قبضہ اور نتیجتاً اسلام کی ایسی زبوں حالی کہ بیان کی تاب نہیں!

پھر یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ ہر مسلمان مرد و عورت، بوڑھے و جوان کو مخاطب کرتی ہے، اس کے سامنے اس مسئلے کا حل پیش کرتی ہے اور اسے باور کراتی ہے کہ ایسی صورتِ حال میں ایمان لانے کے بعد اس کا اہم ترین فرضِ عین کیا ہے؟ وہ فرض جسے نہ نبھانے کی صورت میں مسلمان کا ایمان داؤ پر لگ جاتا ہے کیونکہ ایک طرف تو اللہ تبارک وتعالیٰ جہاد سے دوری کو منافقین کی صفت قرار دیتے ہیں، اور دوسری جانب جہاد سے منہ پھیرنے کا نتیجہ عملاً یہی ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے علاقے کفر کے قبضے میں چلے جاتے ہیں، فتنہ جڑ پکڑ لیتا ہے، مسلمان مغلوب ہو جاتے ہیں، شعائرِ دین پر عمل پیرا ہونا مشکل ہو جاتا ہے اور شرک و ارتداد پھیل جاتا ہے۔ کفر کے اسی غلبے کے تدارک کے لئے، ایسی صورتِ حال میں دفاعی جہاد اہم ترین فرضِ عین بن جاتا ہے۔ عزام شہیدؒ نے اس موضوع پر شرعی دلائل کو اس کتاب میں نہایت جامع اور مدلل انداز میں اکٹھا کیا ہے۔

موجودہ حالات میں جب کہ پندرھویں صدی ہجری کی صلیبی جنگ اپنے عروج پر ہے، اسلام کے بڑے بڑے نام لیوا کفر سے مداہنت، مصالحت اور عدم مخاصمت کا درس دے رہے ہیں، یہ کتاب ایک منارۂ نور ہے جو بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے دین، جان، مال اور عزت پر حملہ ہو جائے تو اوّلیں فرض کیا بنتا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب یقیناً اس لائق ہے کہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلیں اس کو سمجھیں اور اس کے تقاضوں پر عمل کریں۔ اسے نئی نسل کے تعلیمی نصاب میں شامل ہونا چاہیے، کیونکہ اس میں دیے گئے دروس کسی بھی مسلمان سے غیر متعلق نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو جہاد کے گم گشتہ فریضے کے احیاء کا ذریعہ بنائے اور ہمیں امتِ اسلام کے دفاع کے لئے اٹھنے والوں میں شامل فرمائے۔ کیونکہ وقت کا یہ اہم ترین فریضہ اگر نبھایا نہ جاسکا، تو پھر.... یہ جان و مال کس کام کے؟

حافظ ساجد انور

مدیر، دارالعلوم تفہیم الاسلام، نوشہرہ

فتوے کی تائید میں عالمِ اسلام کے بعض دیگر علمائے کرام کی تحریریں

شیخ عمر سیف کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰه و صلى اللّٰه على سيدنا محمد و آله و صحبه و من والاه، و بعد:

اخی فی اللہ، شیخ فاضل، مجاہدِ صادق ڈکتور عبداللہ عزام نے جہاد کے شرعی حکم اور اس کے فرضِ عین ہونے سے متعلق یہ عظیم فتویٰ، یہ قیمتی نصیحت مجھے دکھائی ہے۔ میں نے یہ پورا فتویٰ پڑھا ہے اور اسے بالکل درست اور عین مطابقِ حق پایا ہے۔ یقیناً اس سے نظریں چرانے کی کوئی گنجائش نہیں اور جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ کتاب اللہ، سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماعِ علماء کے ان دلائل کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گا۔ میری رائے یہی ہے کہ اس وقت جہاد کی فرضیت کو ماننا، اس کی ادائیگی کے لئے گھروں سے نکلنا اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جہاد میں شرکت کرنا ہی تقاضائے ایمان ہے اور ایسا کرنے سے صرف اسی طرح کے لوگ رکیں گے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیا تھا:

﴿فَاِذَا اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ (محمد: ٢٠)

”مگر جب ایک صاف صاف مضمون والی سورت نازل کر دی گئی جس میں قتال کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو“۔

یقیناً عظمتوں والے اللہ نے سچ فرمایا! اللہ تعالیٰ شیخ عبداللہ عزام کو، ان کے حسنِ نیت اور بروقت اقدام پر بہترین جزا دے اور ہم سب کو اپنی رضا والی راہ اختیار کرنے کی توفیق دے۔ بلاشبہ جہاد آج فرضِ عین ہے اور کسی کو اس سے پیچھے رہنے کی اجازت نہیں۔

الفقیر الی اللہ، عمر سیف

۲۸-۱۲-۱۴۰۴ھ، جدّہ، مجلسِ کبار العلماء، صنعاء، یمن

سعید حویٰ کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارے محترم بھائی دکتور شیخ عبداللہ عزام نے مجھے یہ کتاب پڑھ کر سنائی ہے۔ میری رائے میں بلا شبہ یہ ایک تحقیق و تنقیح شدہ فتویٰ ہے۔ میں اس کے مضمون کی تصدیق کرتا ہوں اور اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔

سعید حویٰ

شیخ عبداللہ ناصح علوان کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيدنا محمد قائد الغر المحجلين، وعلى آله وأصحابه الذين حملوا راية الجهاد في ربوع العالمين وعلى قادة الحق ودعاة الخير بإحسان إلى يوم الدين، وبعد:

محترم دکتور عبداللہ عزام نے مجھے اپنی تحریر دکھائی ہے جس میں آپ نے افغانستان، فلسطین اور مسلمانوں کے دیگر علاقوں میں جاری جہاد کے شرعی حکم پر بحث کی ہے۔ میں اللہ کی توفیق سے اس بارے میں چند باتیں کہنا چاہوں گا:

جو کچھ شیخ عزام نے یہاں بیان کیا ہے، جو فتویٰ دیا ہے اور سلف وخلف کے عظیم آئمہ کے حوالے سے جو رائے نقل کی ہے، وہ سب درست ہے۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ جب مسلمانوں کے کسی علاقے پر کفار کا قبضہ ہو جائے تو وہاں رہنے والے سب لوگوں پر قتال فرض ہو جائے گا، اور ایسے میں عورت شوہر کی اور بیٹا والدین کی اجازت کے بغیر نکلے گا۔ نیز جب تک مجاہدین کی اتنی تعداد جمع نہ ہو جائے جو مسلمانوں کی اس سرزمین کو کفار سے چھڑانے کے لئے کافی ہو، تب تک اردگرد کے تمام علاقوں پر بھی جہاد فرضِ عین رہے گا۔ اگر وہ لوگ بھی کافی نہ ہوں تو یہ فرضیتِ

عین دائرے کی شکل میں پھیلتی جائے گی اور اپنے قریب ترین اور پھر اس سے قریب ترین لوگوں کو اپنی
لپیٹ میں لے لے گی۔ اگر وہ لوگ بھی کافی نہ ہوں، یا سستی کریں، یا کوتاہی کریں، یا بلا عذر بیٹھے رہیں
تو فرضیت کا یہ دائرہ پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا یہاں تک کہ دشمن کا زور توڑ ڈالا جائے
اور اسے سرزمینِ اسلام سے باہر نکال دیا جائے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا بھر میں موجود مسلمانوں
کی اکثریت افغانستان، فلسطین اور مسلمانوں کی دیگر مقبوضہ سرزمینوں کے معاملے میں سستی اور کوتاہی
کر رہی ہے اور بلا عذر بیٹھی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد آج ہر مسلمان پر فرضِ عین ہو چکا ہے، خواہ وہ
مسلمانوں کے کسی بھی علاقے میں رہتا ہو، تا آنکہ دشمن کو پچھاڑنے کے لئے درکار مالی و افرادی قوت
پوری ہو جائے۔ لہٰذا جو مسلمان بھی ہتھیار اٹھا سکتا ہے، آج اس پر جہاد کے لئے نکلنا فرض ہے، تا کہ وہ
افغانستان اور دیگر مقامات پر برسرِ پیکار مسلمان بھائیوں کی مدد کر سکے۔ اگر والدین اجازت نہ دیں
تب بھی نکلنا لازم ہے۔ اور یہ حکم اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک مجاہدین کی اتنی تعداد جمع نہیں ہو
جاتی جو (کفار کو ان علاقوں سے نکالنے کے لیے) کافی ہو، واللہ اعلم۔

عبداللہ ناصح علوان
جامعۂ ملک عبدالعزیز، جدہ

شیخ محمد نجیب المطیعی کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله وعلى آله و صحابته ومن والاه، أما بعد:

بلا شبہ جہاد فی سبیل اللہ اسی لئے کیا جاتا ہے تا کہ شہادت پائی جا سکے، وہ شہادت جو اللہ کے
چنیدہ بندوں ہی کو ملتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿وَ يَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) ''اور وہ تم میں سے بعض کو شہداء بناتا ہے''۔
شہادت دراصل ایک گھر سے دوسرے گھر، اس دنیا کی تنگنائیوں سے آخرت کی وسعتوں

دھوکے، فریب اور مسلسل پریشانیوں والی اس زندگی سے خوشحالی، مسرت اور کیف وسرور والی لازوال زندگی کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے۔

میرے محترم ومعزز بھائی، عالی مرتبت مجاہد دکتور عبداللہ عزام کا جمع کردہ یہ توشہ نہ صرف جذبۂ جہاد بیدار کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے، بلکہ یہ فریضۂ جہاد پر صدیوں سے پڑی گرد دور کر کے تفسیر، حدیث اور فقہ کے پختہ دلائل کی روشنی میں اس کے حقیقی خدوخال بھی واضح کرتا ہے۔ بلاشبہ شیخ کا منفرد طرزِ استدلال بزدل منافقین کی آنکھوں کا آشوب اور مخالفین کے حلق میں چبھتا کانٹا ہے۔

میں آپ لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے بس یہی کہنا چاہوں گا کہ ان کٹھن حالات میں امت کی مشکلات کے حل اور ملت کے دفاع کے لئے جہاد کا رستہ اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ زندگی بس ایک ہی بار ملی ہے، تو کیوں نہ اسے اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب کی راہ میں لگا دیا جائے!...... تاکہ یہ امت دنیا وآخرت کی رفعتیں، عزتیں اور بقاء ودوام پا سکے۔

مومن درحقیقت اللہ ہی کے لئے جہاد کرتا ہے، لہٰذا اس کی نظر دنیاوی نتائج پر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ہر ناکامی سے سیکھتا ہے، ہر تکلیف اس کے عزم کو بڑھاتی ہے۔ جلاوطنی اسے سفر، جب کہ قید عبادت کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر وہ زندہ رہے تو قیادت، اور قتل کر دیا جائے تو شہادت اس کا مقدر بنتی ہے، دنیا وآخرت کی ساری بھلائیاں تو یہی سمیٹ لے جاتا ہے۔

پس اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں پکار سن کر لبیک کہنے والوں پر؛ اور جب تمہیں جہاد کے لئے پکارا جائے تو نکل پڑو!

ناحیۂ شارع الجہاد، جدہ
محمد نجیب المطیعی، خادمِ سنتِ رسول ﷺ
(مصنفِ کتاب تکملة المجموع شرح المهذب)
رکن انجمنِ مصنفین، مصر

پیش لفظ

اک فرض جسے ہم بھول گئے!

احسن عزیز

''جہاد فی سبیل اللہ'' ایک قرآنی امر اور شرعی اصطلاح ہے جس کے بارے میں چند اساسی باتوں کی تذکیر ضروری ہے۔ یہ کوئی نئی باتیں نہیں لیکن مختصراً ان کی یاد دہانی اس لئے اہم ہے کہ؛ ایک تو طبعاً ناگوار ہونے کی وجہ سے اپنوں نے اس فرض کو بھلایا ہوا ہے اور دوسرے؛ ''متعدی'' ہونے کے باعث کافروں نے اپنا سارا زور اس بات پر لگا دیا ہے کہ اس اصطلاح کو اس قدر متنازعہ، مبہم اور بدنام کر دیا جائے کہ امتِ مسلمہ جہاد کی بات کو اپنی بات سمجھنے ہی سے انکار کر دے اور مسلمان اس موضوع پر معذرت خواہانہ رویہ اپنا لیں۔ لیکن اسلام اللہ تبارک وتعالیٰ کا سچا دین ہے اور اس کی حفاظت اُسی ہستی کے ذمے ہے۔ ہمارا فرض صرف اتنا ہے کہ اُس سے توفیقِ عمل مانگیں اور ہدایت کی نیت سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہیں۔ جب ہم ایسا کریں گے تو اُس چیز کی طرف ہمیں صحیح ہدایت مل ہی جائے گی جس میں ہماری زندگی ہے۔ اللہ ربّ العزت کا وعدہ ہے: ﴿وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ (الشوریٰ: ۱۳) ''اور جو شخص (اللہ کی طرف) رجوع کرے تو وہ اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے''۔ اور یہ بھی کہ: ﴿وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ﴾ (المؤمن: ۱۳) ''اور نصیحت تو صرف وہی شخص قبول کرتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے''۔

ان اساسی باتوں کی یاد دہانی اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس باب میں قرآن وسنت کے نصوص اور فقہائے ملّت کی تشریحات سے توجہ ہٹ جائے تو جہاد فی سبیل اللہ کی حیثیت محض ایک قومی جدوجہد یا آزادی کی تحریک سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اور یوں اعلائے کلمۃ اللہ کا ہدف گُم ہو جاتا ہے، دعوت الی اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا رنگ معدوم پڑ جاتا ہے، جہاد کا عمل سیاسی کھیل تماشوں اور مذاکراتی نمائشوں کی نذر ہو جاتا ہے، اللہ پر توکل کے بجائے انسانوں سے

امیدیں باندھ لی جاتی ہیں نتیجتاً اس راہ کے راہی اُن برکات، روحانی نشو ونما اور ایمانی کیفیات سے محروم رہ جاتے ہیں جو اس راہ کا خاصہ ہے۔ انجام کار اس راہ میں دوڑنے بھاگنے والے تھک جاتے ہیں۔ بعض کفار کے ساتھ مصالحت کر لیتے ہیں، اور بعض دوسرے مایوس ہوکر یہ راستہ چھوڑ بیٹھتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وعید کے مصداق بن جاتے ہیں: ((مَا تَرَکَ قَوْمٌ الْجِهَادَ اِلَّا عَمَّهُمُ اللّٰهُ بِالْعَذَابِ)) (رواه الطبراني بأسناد حسن) ''کبھی کسی قوم نے جہاد نہیں چھوڑا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے (بطور سزا) اُن پر عام عذاب مسلط کر دیا''۔

ا۔ جہاد ایک عبادت ہے

پہلی بات جسے ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں تازہ رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ جہاد ایک عبادت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عبادت ہی انسان کا مقصدِ زندگی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰرِيٰت: ۵۶) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں''۔

اپنی زندگی کو عبادت سمجھ کر گزارنے والا مومن کبھی بھی جہاد کو غیر اہم نہیں سمجھ سکتا۔ جس مقصدِ اصلی کے لئے وہ دیگر ساری عبادات بجالاتا ہے اسی مقصد کے لئے وہ اپنا مال اور جان اللہ کے راستے میں کھپاتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ یہ راستہ اللہ کے قرب اور فلاح کے حصول کا یقینی راستہ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِىْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (المائدة: ۳۵)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ کا قرب ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے''۔

پس جہاد سے بندۂ مومن کا تعلق کسی عارضی سبب سے نہیں، بلکہ یہ اس کی زندگی کا مستقل طریق ہے، ایک مسلسل عبادت ہے جس کا حاصل الحصول اس کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اسے جنت مل جائے اور اس کا مالک اس سے راضی ہو جائے اور ہمیشہ کی خوشیاں اُس کے نصیب میں آ جائیں۔ وہ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے گھڑے گئے پیچیدہ انسانی فلسفوں میں نہیں الجھتا بلکہ ایک سیدھی

سادی سی الٰہی پیشکش اُس کے لئے زادِ راہ بن جاتی ہے:

﴿فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ اَجْرًا عَظِيمًا﴾ (النساء: ۷۴)

''پس جو لوگ آخرت کو خریدنا اور اس کے بدلے میں دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں اُن کو چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اور جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے یا غلبہ پائے، ہم عنقریب اس کو بڑا ثواب دیں گے''۔

آخرت کا سچا خریدار جہادی زندگی ہی کو اپنی اصل اور بھرپور زندگی سمجھتا ہے۔ اس عظیم عبادت کی خاطر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی بطور نمونہ اس کے سامنے ہوتی ہے، صحابہ ءکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کردار اور اُن کی قربانیاں اُس کی نگاہ میں رہتی ہیں جو ساری عمر جہاد میں گزارنے اور شہادت کے حصول تک کفار سے لڑتے رہنے کو ایک مثالی زندگی گردانتے تھے، جو ہجرت مدینہ کے بعد بھی ایک محاذ سے دوسرے محاذ کی طرف ''ہجرت'' کرتے رہے اور جن کی کرۂ ارض کے شرق و غرب میں پھیلی ہوئی قبریں اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد بھی ان کی زندگیوں کا لائحۂ عمل کیا تھا؟ اپنا گھر بار چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلنے والے اس غازی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنگِ میل بن جاتا ہے: ((إنَّ الهجرة لا تنقطع ما دام الجهاد)) (صحيح الجامع ۱۹۸۷) ''جب تک جہاد باقی ہے، ہجرت کا عمل منقطع نہیں ہوسکتا''۔

ان تصورات کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مومن جنگ کو اس نگاہ سے کبھی نہیں دیکھتا جس نگاہ سے دیگر اقوام کے لوگ دیکھتے ہیں۔ وہ محض تبھی جنگ نہیں کرتا جب ایسا کرنا خارجہ پالیسی کا تقاضا ہو، یا یہ ایک وقتی ضرورت ہو، نہ ہی اس کے نزدیک جنگ محض کسی فعل کا ردعمل ہوتا ہے۔ بلکہ ایک عظیم عبادت کی ادائیگی اور بدلے میں جنت کا حصول اس کا نصب العین ہوتا ہے۔

۲۔ کوئی دوسری عبادت جہاد کے برابر نہیں

دوسری بات یہ کہ جہاد ایک ایسی عبادت ہے کہ جس کے برابر مقام اللہ تعالیٰ نے کسی اور عبادت کو نہیں دیا۔ اور یہ بات ہمارے ایمان کا حصہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمیں

بتاتی ہے کہ ایمان لاکر جہاد فی سبیل اللہ کرنے کو دوسری نیکیوں کے برابر قرار دینا اللہ تعالیٰ کو اتنا ناپسند ہے کہ اللہ نے ایسا کرنے والوں کو ظالم کہہ کر پکارا اور اُن کے لئے ہدایت کے دروازے بند کرنے کا اعلان فرمادیا:

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ (التوبة: ۱۹-۲۲)

”کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے؟ یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں بہت بڑے مرتبہ والے ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ انھیں ان کا رب خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت کی اور رضامندی کی اور جنتوں کی۔ جن میں اُن کے لئے نعمت ہائے جاودانی ہے (اور وہ) اُن میں ابدالآباد رہیں گے۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ کے ہاں بڑا صلہ (تیار) ہے“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: ”دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ يَعْدِلُ الْجِهَادَ“. قَالَ: ((لَا اَجِدُهٗ)). قَالَ: ((هَلْ تَسْتَطِيْعُ اِذَا خَرَجَ الْمُجَاهِدُ اَنْ تَدْخُلَ مَسْجِدَكَ فَتَقُوْمَ وَلَا تَفْتُرَ وَ تَصُوْمَ وَلَا تُفْطِرَ)) قَالَ: ”وَمَنْ يَسْتَطِيْعُ ذٰلِكَ؟“ ”مجھے ایسا عمل بتلایئے جو جہاد کے برابر ہو“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایسا کوئی عمل میں نہیں پاتا“ پھر فرمایا: ”کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ جب مجاہد جہاد کے لیے نکلے تو تم مسجد میں جا کر مسلسل نماز میں کھڑے رہو، ذرا دم نہ لو: برابر روزہ رکھے رہو، کبھی افطار نہ کرو (جب تک کہ وہ مجاہد واپس لوٹ نہ آئے)“۔ اس شخص نے کہا: ”بھلا کون ہے جو

ایسا کر سکتا ہو؟'' (بخاری: کتاب الجهاد والسير، باب فضل الجهاد والسير)

شیطانی وسوسوں کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کم درجے کی عبادات کو اہم تر بنا کر پیش کرتا ہے تا کہ ایک مسلمان اُن میں مشغول ہو کر بڑے اجر و ثواب سے محروم رہ جائے۔ اسی طرح وہ فرض کی ادائیگی کے موقع پر انسان کا پیسہ، وقت اور صلاحیتیں نفل و مستحب درجے کی نیکیوں میں لگوا دیتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ یہ وسائل اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول میں کھپ جائیں اور اللہ کے دین کو سربلندی نصیب ہو۔ موجودہ حالات میں جب کہ امتِ مسلمہ کفار کی براہِ راست یلغار کا شکار ہے، اہلِ استعداد کو دیکھنا چاہیے کہ اُن کی توانائیاں، کفر کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کے لئے کس حد تک کام آ رہی ہیں؟ کیونکہ اس یلغار کا مقابلہ ہر مرد، عورت بوڑھے اور جوان پر فرض ہے۔

۳۔ یہ عظیم ترین عبادت اسلام میں فرض ہے

تیسری اہم بات یہ کہ جہاد کی یہ عظیم عبادت ہم پر فرض کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اہلِ ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (البقرة:۲۱۶)

''(مسلمانو!) تم پر قتال فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں (طبعاً) ناگوار تو ہوگا، مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔ اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو۔ اور (ان باتوں کو) اللہ ہی بہتر جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے''۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ (الحجرٰت:۱۵)

''مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (پکا) ایمان لائیں، پھر شک و شبہ نہ کریں، اور اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہیں، (اپنے دعوئ ایمان میں) یہی سچے اور راست گو ہیں''۔

بندۂ مومن، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عائد شدہ اس فرضیت کو

عقیدے میں راسخ کر لیتا ہے اور اس سے انکار کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس حکمِ شرعی سے فرار، روگردانی یا غفلت اس کے نزدیک ایک عظیم گناہ ٹھہرتا ہے، چہ جائیکہ وہ کسی غازی کو اس راہ سے رُک جانے یا اسے چھوڑ دینے کا مشورہ دے۔ امام عبداللہ عزامؒ فرماتے ہیں:

''اور اس امت کے نوجوانوں کو جہاد سے روکنے والے خبردار رہیں کہ اُن میں اور کسی کو نماز یا روزے سے روکنے والے میں کوئی فرق نہیں ہے! کیا جہاد سے نوجوانوں کو روکنے والے اس بات سے نہیں ڈرتے کہ وہ بالواسطہ طریقے سے ہی سہی، اس آیت کے عام معنی کے تحت آجاتے ہیں: ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى﴾ (العلق: ۹-۱۰)

''بھلا تم نے اُس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے''۔ (دیکھنا قافلہ چھوٹ نہ جائے: ص ۵۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ ءکرام رضی اللہ عنہم کی جس نسل کی تربیت فرمائی، خود اس کا رویہ بھی جہاد کے معاملے میں بہت واضح تھا۔ دوسرے خلیفہ ءراشد سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ بعض مسلمانوں نے بلادِ شام کو فتح کرنے کے بعد وہیں بسیرا کر لیا ہے اور جہاد چھوڑ کر کھیتی باڑی میں مشغول ہو گئے ہیں تو آپ نے ایک آدمی بھیج کر سارے کھیت جلوا دیئے اور محض ایک سطر کا یہ خط بھی لکھا کہ:

إنكم إن تركتم الجهاد واشتغلتم بالزرع ضربت عليكم الجزية وعاملتكم معاملة أهل الكتاب، أن اقواتكم من أقوات أعدائكم.

''اگر تم جہاد ترک کر کے زراعت اختیار کر لو گے تو میں تمہارے اوپر جزیہ عائد کر دوں گا اور تمہارے ساتھ اہلِ کتاب کا سا معاملہ کروں گا۔ تمہارا رزق تمہارے دشمنوں کے ہاتھ میں ہے، اسے وہیں سے حاصل کرو''۔

(في تربية الجهادية والبناء للشيخ عزامؒ، الجزء الأول ص ۳۵)

۴۔ ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی فرضیت قیامت تک کے لئے ہے

جہاد کا سلسلہ، فتنۂ کفر کے خاتمے اور دعوتِ توحید کے غلبے تک جاری رہے گا۔ حق و باطل کی یہ عملی کشمکش قیامت تک کے لئے ہے۔ قرآن وحدیث کی واضح نصوص اس جانب ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

((بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ حَتّٰى يُعْبَدَ اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ جُعِلَ رِزْقِيْ تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِيْ وَ جُعِلَ الذُّلُّ وَالصَّغَارُ عَلٰى مَنْ خَالَفَ اَمْرِيْ وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) (أحمد: مسند المكثرين)

''مجھے قیامت تک کے لیے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کی جانے لگے۔ اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے تلے رکھا گیا ہے۔ اور جس نے بھی میرے امر کی مخالفت کی، اس کے لئے ذلت اور پستی رکھ دی گئی ہے۔ اور جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انھیں میں (شمار) ہوگا''۔

اور ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَزَالُ عِصَابَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ قَاهِرِيْنَ عَلٰى عَدُوِّهِمْ لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ وَ هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ)) (صحيح مسلم: كتاب الإمارة)

''میری امت کا ایک گروہ اللہ کے حکم کے مطابق قتال کرتا رہے گا، یہ لوگ اپنے دشمنوں پر چھائے رہیں گے، جس کسی نے ان کی مخالفت کی وہ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی اور وہ اسی راہ پر قائم ہوں گے''۔

ان واضح بشارتوں پر یقین رکھنے والا کوئی بھی مسلمان، چاہے وہ آج کی دنیا کا باسی ہو یا کسی بھی دور کا، جہاد فی سبیل اللہ کی تا قیامت مشروعیت اور فرضیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ''جہاد کا تسلسل'' اُس کے ایمان کا حصہ ہوتا ہے۔ مجاہدین کی فتح ونصرت کی ان سچی خوش خبریوں کے ہوتے ہوئے وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کا غلام اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی ہوتا ہے لہٰذا

اُس کے لئے اہم یہ نہیں ہوتا کہ کفر و اسلام کی اس جنگ میں کب کس کا پلہ بھاری رہتا ہے؟ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ خود اُس کا وزن نصرتِ ربّ کے پلڑے میں کس حد تک ہے؟ وہ جہاد کو اسلام کا ایک اہم رکن سمجھتا ہے، اسے فرض قرار دینے والے کی عظمت اُس کے دل میں ہوتی ہے، اُسی پر اس کا توکل و بھروسہ ہوتا ہے نتیجتاً دشمن کی حیثیت اُس کے نزدیک خس و خاشاک سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔

معذرت خواہوں نے موجودہ دور میں جہاد فی سبیل اللہ کے معاملے میں طرح طرح کی تاویلیں کیں، بزدلوں نے آنکھیں بند کر کے اسے ناقابلِ عمل گردانا، وطن پرستوں نے اسے صرف قومی ضرورت سے مشروط کیا، منحرفین نے سرے سے ہی اس حکمِ شرعی کو معطل قرار دیا۔ لیکن پھونکوں سے اس چراغ کو بجھانے والے نہیں جانتے کہ اللہ کی توفیق سے اللہ کی راہ میں لڑنے والے لڑتے رہیں گے اور قیامت تک دنیا کے منظر نامے پر موجود رہیں گے، ان شاء اللہ۔ جاہلی عالمی نظام کے پیروکار اور بقائے باہمی و بین المذاہب ہم آہنگی کے نام پر اس تہذیب کو گنجائشیں دینے والے چاہے ان مجاہدین کی کتنی ہی مخالفت کر لیں۔

۵۔ دعوتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ جہاد کے بنیادی مقاصد ہیں

دعوتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ جہاد کے بنیادی مقاصد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بات کو اپنے ارشادات سے واضح فرمایا:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، فَمَنْ قَالَ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ عَصَمَ مِنِّیْ نَفْسَهٗ وَمَالَهٗ اِلَّا بِحَقِّهٖ، وَحِسَابُهٗ عَلَی اللّٰهِ)) (البخاري، کتاب الجهاد)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہیں۔ پس جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اس نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، مگر کسی حق کے بدل۔ اور اس کا حساب اللہ پر رہے گا''۔

پس دنیا میں کلمہ ءِ توحید لا الٰہ الا اللہ کی دعوت اور اس کا غلبہ مجاہدِ فی سبیل اللہ کا ہدف ہوتا ہے، وہ اس دنیا اور ساری کائنات کو اللہ کی ملک سمجھتا ہے۔ دعوتِ دین کے پھیلاؤ اور غلبے کی محبت کے باعث اُس کا رویہ ہمیشہ داعیانہ ہوتا ہے۔ اپنے ذریعے سے ایک شخص کے ہدایت پانے کو وہ سو سرخ

اُونٹوں کے ملنے سے بہتر سمجھتا ہے۔لیکن جن کے نصیب میں ہدایت کے بجائے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنا مقدر ہو، اُنھیں اسلام کے راستے سے ہٹانے کا کام اپنے ذمے فرض سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے یہ ناگزیر ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰه﴾ (الأنفال: ۳۹)

''اوران کافروں سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے''۔

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبة: ۲۹)

''جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روزِ آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کی ہیں، اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں، (اُن سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں''۔

مفسرینِ قرآن نے صراحت سے یہ بات لکھی ہے کہ مندرجہ بالا آیت (آیتِ قتال) نے اہلِ کتاب سے درگزر کے بارے میں اس سے پیشتر اترنے والی متفرق آیات مثلاً: ﴿فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرة: ۱۰۹) کو منسوخ کیا ہے۔سورہ توبہ کے یہ احکامات نزولِ وحی کے آخری دور میں نازل ہوئے اس لئے ان کے حکم کی حیثیت حتمی ہے، اور یہی وہ عالمگیر لائحہ عمل ہے جو کرہ ارض پر قائم ہونے والی کسی بھی اسلامی امارت کے لئے ناگزیر ہے، کیونکہ اللہ کی زمین پر اللہ کے حکم کو جاری کرنا، کفر کی شان و شوکت کو توڑنا اور اس کی برتری کو ختم کرنا اس کے ذمے واجب ہے۔اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو دنیا والے اہلِ کفر سے مرعوب ہو جاتے ہیں، توحید کی جگہ شرک پھیلنے لگتا ہے، عدل کی جگہ ظلم لے لیتا ہے، مسلمان دب کر

جاتے ہیں اور شعائرِ اسلام ایک ایک کر کے معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ ''فتنہ'' جس کے خاتمے کے لئے کفار سے جہاد، ہم پر فرض کر دیا گیا ہے اور اس کے بغیر اللہ کا دین اللہ کی سرزمین پر قائم نہیں ہو سکتا۔

الغرض زمین پر سے یہود و نصاریٰ و مشرکین کے قائم کردہ کفر کے نظاموں کو ختم کرنے اور اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی بالادستی کو قائم کرنے کے لیے خود آگے بڑھ کر کفار پر حملہ کرنا اور انھیں زیر کرنا (جب کہ اقدام کی شرعی شرائط، جن کی وضاحت کتبِ فقہ میں موجود ہے، پوری ہوں) جہاد کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ اور یہ بات واشگاف ہے کہ آج دنیا میں اسلام کا جو پھیلاؤ ہمیں نظر آتا ہے، وہ ہمارے اسلاف کی دعوتی و تبلیغی جدوجہد کے بعد انھی احکام جہاد پر عمل کا نتیجہ ہے یعنی ایمان، یا پھر جزیہ، ورنہ جنگ! فارس و روم اسی کلیے کی برکت سے فتح ہوئے، سندھ و ہند میں اسی فکر نے ہمارے آباء و اجداد کو بتوں کی نجاست سے چھڑایا، (چینی مقبوضہ) مشرقی ترکستان، اور ماوراءالنہر کے علاقے سورۂ توبہ کی انھی روشن آیات پر عمل کرنے سے اسلام کے زیرِ نگیں آئے۔ افریقہ اور یورپ کی تاریکیوں میں توحید کا نور اسی جہادی عقیدے کی بدولت پھیلا۔ فقہ میں جہاد کی اس اصطلاح کو اقدامی جہاد (جہاد الطلب) کہتے ہیں۔ مسلمانوں پر یہ جہاد فرضِ کفایہ ہے۔

حقیقت میں تہذیبِ کفر کی عالمگیر فکری و عسکری شکست کے بغیر، اُس عدل پر تمام انسانیت کا کھڑا ہونا ناممکن ہے، کہ جس پر یہ آسمان و زمین قائم ہیں۔ توحید کی بالادستی تبھی ہو سکتی ہے جب اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کی جائے گی:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ (الحدید: ۲۵)

''ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا۔ اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے لئے اور بھی فائدے ہیں اور تاکہ اللہ معلوم کر لے کہ کون اس کی اور اس

کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ قوت والا اور زبردست ہے''۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ بطور مسلمان ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کفار کا یہ ظاہری عروج [illegible] ہے اور کفر و اسلام کی جنگوں میں حتمی فتح اسلام اور اہلِ اسلام کی ہے کیونکہ اللہ نے نصرت اور فتح کے [illegible] وعدے ہم سے کر رکھے ہیں وہ سچے ہیں:

﴿ اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡہَادُ ﴾ (المؤمن: ۵۱)

''ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے (یعنی قیامت کو بھی)''۔

﴿ وَ لَا تَہِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴾ (الِ عمران: ۱۳۹)

''اور سست نہ ہو اور نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو''۔

۶۔ ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے شرعی معنی کفار سے جنگ کرنا ہے

ایک اور اساسی بات یہ ہے ''جہاد'' کے عمومی (لغوی) معنی تو ''بھرپور کوشش اور جدوجہد'' ہی [illegible] ہیں لیکن شریعت کی اصطلاح میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' سے مراد ''بذل الجهد فی قتال الکفار'' یعنی کفار کے خلاف جنگ میں اپنی پوری قوت کھپا دینا ہے۔ لفظ ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے الفاظ قرآن و حدیث میں جہاں بھی مطلقاً استعمال ہوئے ہیں اس کے یہی معنی ہیں۔ لفظ جہاد جب [illegible] ہمارے سامنے آئے گا ہم اس سے یہی مراد لیں گے، الا یہ کہ کسی جگہ جملے میں کوئی ایسا ''قرینہ'' اور [illegible] ایسا واضح اشارہ موجود ہو کہ یہاں 'جہاد' سے اس کے اصطلاحی معنی مراد نہیں لئے جا رہے بلکہ یہاں یہ [illegible] اپنے لُغوی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ قرآن و حدیث میں بعض مقامات پر لفظ جہاد اپنے [illegible] لُغوی معنوں میں کئی جگہ استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً؛ قرآن کا یہ حکم کہ: ﴿ فَلَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ جَاہِدۡہُمۡ بِہٖ جِہَادًا کَبِیۡرًا ﴾ (الفرقان : ۵۲) ''سو آپ ان منکروں کا کہنا مت مانیے، اور [illegible] کا مقابلہ کیجیے اس (قرآن) کے ساتھ بڑے زور سے''۔ اور یہ کہ: ﴿ وَ اِنۡ جَاہَدٰکَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡہُمَا وَ صَاحِبۡہُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا...

(لقمٰن: ۱۵) ''اور اگر وہ دونوں (والدین) تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہا نہ ماننا۔ ہاں دنیا کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا''۔ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ: ((...وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) (صحیح ابن حبان).....

ایسے تمام مقامات پر جملے میں کوئی نہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہوتا ہے یا جملے کا سیاق وسباق خود یہ بتاتا ہے کہ یہاں لفظِ جہاد اپنے لُغوی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن اگر ایسا کوئی قرینہ موجود نہ ہو اور لفظِ جہاد مطلقاً استعمال ہو رہا ہو تو اس سے اللہ کے رستے میں لڑنا ہی مراد لیا جائے گا، کیونکہ شریعت کی اصطلاح میں اس کے یہی معنی ہیں۔ پس چند جگہوں پر لفظِ جہاد کا لغوی استعمال اس کے اصلی اصطلاحی معنوں کو نہیں بدلتا، نہ اس سے جہاد فی سبیل اللہ کی مشروعیت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں ''نفس کے خلاف جہاد'' یا ''شیطان کے خلاف جہاد'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، یہ جہاد کے شرعی معنی اور حکم کی پیروی سے بے نیاز نہیں کرتی۔ اسی لیے جب حدیث یا فقہ کی کسی کتاب میں جہاد کا باب باندھا جاتا ہے تو اس کے تحت جنگ اور قتال کے سوا کوئی اور بحث نہیں ملتی۔ کبھی تزکیہء نفس، دعوت وتبلیغ وغیرہ کے موضوعات ان ابواب میں نہیں ملتے، کبھی نمازیوں، روزے داروں کو مجاہدین کے لقب سے نہیں پکارا جاتا، کیونکہ شریعت کی اصطلاح میں جہاد فی سبیل اللہ سے مراد قتال فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہیں۔ صحابہ ءکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی جب کبھی جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا جاتا تھا وہ اس بات سے وہی امرِ شرعی مراد لیتے تھے جس سے خود اُن کی سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ لہٰذا قرآن کی آیاتِ جہاد کو اپنے اصل معنوں سے پھیر کر ان کی کوئی نئی تاویل کرنا اور احادیث میں وارد ہونے والے جہاد کے فضائل کو کسی اور عمل پہ منطبق کرنا، خواہ شعوراً ہو یا غیر شعوراً، عملاً تحریف ہی کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ تحریف یہود ونصاریٰ کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہوگی، وہی اس مہم کے سرخیل ہیں اور چاہتے ہیں کہ امت اپنے اجتماعی مقاصد اور اہداف سے ہٹ جائے کیونکہ اسی میں اُن کے پھیلائے ہوئے فتنوں کی بقا ہے۔

امام عبداللہ عزام شہیدؒ اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی کتاب ''میدان پکارتے ہیں''

میں تحریر کرتے ہیں:

''**لغوی معنی**: جہاد کا لفظ جهد يجهد جهدًا سے ماخوذ ہے۔ خواہ یہ ضمہ (پیش) سے (جُهد) ہو یا فتح (زبر) سے (جَهد) معنی وہی ہیں یعنی وسعت اور طاقت۔ کہا گیا ہے کہ جُہد کا مطلب ہے وسعت اور طاقت اور جَہد کا مطلب ہے مشقت۔ جَہد کو غایت کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے؛ وأقسموا بالله جَهدَ أيمانهم. ''انہوں نے بڑی سے بڑی قسمیں کھائیں''۔ چنانچہ جهد اور جہاد کا لغوی معنی بنا:

''کسی پسندیدہ چیز کے حصول یا ناپسندیدہ چیز کو رفع کرنے کی غرض سے انسانی استطاعت وطاقت کے مطابق ہر ممکنہ کوشش کرنا''۔

(دیکھئے لسان العرب اور قاموس المحيط)

اصطلاحی معنی: إتفق الفقهاء الأربعة أن الجهاد هو القتال و العون فيه.

چاروں آئمہ اس پر متفق ہیں کہ جہاد کا مطلب ہے قتال اور اس میں مدد دینا۔

آپ کے لیے چاروں فقہاء کے نزدیک جہاد کی تعریفیں درج کی جارہی ہیں:

۱۔ حنفیہ:

ابنِ ہمام کی فتح القدیر ج ۵ ص ۱۸۷ پر وارد ہے کہ:

''الجهاد: دعوة الكفار إلى الدين الحق وقتالهم إن لم يقبلوا''

''دینِ حق کی طرف کفار کو دعوت دینا اور اگر وہ قبول نہ کریں تو ان سے جنگ کرنا''۔

اور امام کاسانی بدائع ج ۹ ص ۴۲۹۹ پر لکھتے ہیں: ''بذل الوسع والطاقة بالقتال في سبيل الله عز وجل بالنفس والمال واللسان وغير ذلك.''

''اللہ کے رستے میں جنگ کے لیے نفس، مال اور زبان وغیرہ کی پوری طاقت لگا دینا''۔

۲۔ مالکیہ:

''قتال المسلم كافراً غير ذی عهد لإعلاء كلمة الله أو حضوره له أو

دخوله أرضه له".(حاشيه عدوي صعيدي ج ۲ ص ۲ .اور شرح صغير. أقرب المسالک للدردير ج ۲ ص ۲۶۷)

""مسلمان کا غیر ذی عہد کافر سے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کرنا۔ یا جنگ کے میدان میں حاضر ہونا یا معرکے کی زمین میں داخل ہونا۔"

۳۔شافعیہ:

"الجهاد أي قتال فی سبيل الله "(الباجوری۔ابن القاسم ج ۲ص۲۶۱)

امام باجوری نے کہا: الجهاد یعنی قتال فی سبيل الله۔

امام ابن حجر العسقلانیؒ کہتے ہیں:

"وشرعا بذل الجهد في قتال الكفار".(الفتح ج ۶ ص ۳)

""شرعاً اس کے معنی ہیں کفار سے جنگ میں پوری کوشش صرف کر دینا""۔

۴۔حنبلیہ:

"قتال الكفار". 'الجہاد' کفار سے قتال ہے۔(مطالب أولي النهى ج ۲ ص ۴۹۷)

اور ''الجهاد:القتال و بذل الوسع منه لإعلاء كلمة الله تعالى". (دیکھیے عمدة الفقه ص۱۶۶. اور منتهى الإرادات ج اول ص ۳۰۲)

""جہاد قتال ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے تمام تر کوشش صرف کرنا ہے""۔

(""میدان پکارتے ہیں""ازعزامؒ،ص۲۱)

اسی طرح شیخ عزامؒ اپنی کتاب ""دیکھنا قافلہ چھوٹ نہ جائے"" میں صفحہ۶۴ پر لکھتے ہیں ""جب للق لفظِ جہاد کہا جائے تو اس سے مراد اسلحے سے جنگ کرنا ہے، یہ ابنِ رشد کا قول ہے اور اس پر روں آئمہ متفق ہیں""۔

جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں پھیلائے گئے اسی طرح کے چند شبہات کو دور کرتے ہوئے لانا فضل محمد، الاستاذ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، اپنی کتاب ""جنگِ خندق""

میں رقم طراز ہیں:

''**جہاد کی تعریف**: بنیادی طور پر یہ بات جان لینی چاہیے کہ کسی حکم کی ''شرعی حیثیت'' اوراس کا ''شرعی مقام'' اس کی شرعی تعریف سے معلوم ہوسکتا ہے۔''لغوی مفہوم'' پر ''شرعی احکام'' کا مدار نہیں ہوتا۔

دیکھئے صلوٰۃ کا لغوی مفہوم صرف دعا ہے لیکن اس کا مدار شرعی مفہوم پر ہے، صرف دعا کو شرعی نماز نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح زکوٰۃ کا شرعی مفہوم بڑھنے اور تزکیہ کا ہے، لیکن اس کا ایک شرعی اصطلاحی مفہوم اور تعریف ہے۔ احکام کا مدار اس شرعی مفہوم پر ہے۔ اسی طرح لفظ صوم بمعنی روزہ ہے ۔اس کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ ایک گھڑی تک کھانے پینے کو ترک کرنا۔ اس مفہوم میں انسانوں کے علاوہ حیوانات کا دانہ پانی ترک کرنا بھی صوم اور روزہ میں داخل ہے، لیکن اس کا ایک شرعی اصطلاحی مفہوم ہے جس پر احکامات کا مدار ہے اور شرعاً اسی کا اعتبار ہے۔ اسی طرح ''حج'' کا لغوی مفہوم قصد ہے۔ اب ایک آدمی شہر یا گھر جانے کا قصد کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میں حج کر رہا ہوں کیوں کہ حج بمعنی قصد ہے اور میں نے قصد کرلیا ہے۔ لیکن حج کا ایک شرعی مفہوم ہے، شریعتِ مقدسہ مین اسی کا اعتبار ہے اور لغوی مفہوم لینا شرعاً بے کار ہے اور اس طرح کی تاویلات کرنے والا غدار ہے۔

بالکل اسی طرح لفظ ''جہاد'' ہے۔ اس مظلوم لفظ کا لغوی مفہوم تو محنت ہے لیکن اس کا ایک شرعی مفہوم ہے اور اس کی ایک اصطلاحی تعریف ہے۔ اب اس شرعی مفہوم کو چھوڑ کر اس کے لغوی مفہوم کو عام کرنا اور اس کی آڑ لے کر شرعی جہاد سے پہلو تہی کرنا اور اس میں سستی کرنا اور طرح طرح کی تاویلات میں عوام الناس کو الجھائے رکھنا جہاد پر ظلم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بدخواہی اور کافروں کی خیر خواہی کے مترادف ہوگا جس سے ہر مسلمان کو احتراز کرنا لازم ہے۔

اب میں چند تعریفات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ سب سے پہلے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک (سے کی گئی جہاد) کی تعریف پیش کرتا ہوں، سن لیجئے:

۱۔ ((قَالَ فَاَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ؟ قَالَ الْجِھَاد، قَالَ وَ مَا الْجِھَادُ؟ قَالَ اَنْ تُقَاتِلَ الْکُفَّارَ اِذَا لَقِیْتَھُمْ وَلَا تَغُلَّ وَ لَا تَجْبُنَ)) (کنز العمّال ج ۱ ص ۷۶)

"(ایک) صحابیؓ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے افضل ہجرت کون سی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین ہجرت جہاد کی ہجرت ہے۔ صحابیؓ نے پوچھا کہ جہاد کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاد یہ ہے کہ تم بوقتِ مقابلہ کفار سے لڑو اور اس راستے میں نہ خیانت کرو اور نہ بزدلی دکھاؤ"۔

((قِیْلَ وَ مَا الْجِھَادُ؟ قَالَ اَنْ تُقَاتِلَ الْکُفَّارَ اِذَا لَقِیْتَھُمْ. قِیْلَ فَاَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ؟ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُہٗ وَ اُھْرِیْقَ دَمُہٗ)) (کنز العمّال ج ۱ ص ۲۷)

"پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جہاد کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاد یہ ہے کہ تم مقابلے کے وقت کفار سے لڑو، کہا گیا کہ افضل ترین جہاد کون سا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کا جہاد جس کا گھوڑا کٹ مرے اور خود اس کا خون گر جائے (یعنی وہ شہید ہو جائے)"۔

۲۔وَفِی الْحَدِیْثِ الصَّحِیْحِ الَّذِیْ رَوَاہُ الْاِمَامُ اَحْمَدُؒ: ((قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ قِتَالُ الْکُفَّارِ)) (رواہ احمد بحوالہ شیخ عزام شہیدؒ)

"مسندِ احمد کی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ اللہ کے راستے کا جہاد کیا ہوتا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کافروں سے لڑنے کا نام جہاد ہے"۔

۳۔ الجھاد بکسر الجیم أصلہ لغۃ ھو المشقۃ و شرعاً بذل الجھد فی قتال الکفار. (فتح الباري ج۶ ص ۴)

"جہاد کسرۂ جیم کے ساتھ لغت میں بمعنی محنت و مشقت ہے۔ اور اصطلاحِ شرع میں کفار سے لڑنے میں اپنی پوری طاقت کو استعمال کرنے کا نام جہاد ہے"۔

۴۔ اَلْجِهَادُ هُوَ قَهْرُ الْاَعْدَاءِ اَیْ الْمُحَارَبَۃُ مَعَ الْکُفَّارِ .(شرح شرعۃ الاسلام ص ۵۱۷)

''دین کے دشمنوں کو مغلوب کرنے اور کفار سے لڑنے کا نام جہاد ہے''۔

۵۔ '' اَلْجِهَادُ '' قتال با دشمنان (قاموس مادہ: ج ۵)

''یعنی دشمنانِ اسلام سے لڑنے کا نام جہاد ہے''۔

محترم بھائیو، دوستو اور بزرگو! یہ شرعی جہاد ہے۔ اس میں ہر تعریف میں کافروں سے لڑنے کا لفظ موجود ہے۔ لہٰذا جو شارع نے سمجھایا اور پھر سلف نے سمجھ کر تعریف کی ہے اور کتابوں میں موجود ہے اسی پر اعتماد رکھو اور کسی کے زورِ خطابت سے دھوکہ نہ کھاؤ۔

جہاد کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک اقدامی ہے جس کے لئے چند شرائط فقہائے کرام نے بیان کی ہیں جو درجِ ذیل ہیں: (۱) سرپرست کی اجازت ہو۔ (۲) بعض کے ہاں طاقت کا توازن ہو۔ (۳) امیرِ عام ہو۔ (۴) دعوت الی الاسلام ہو؛ یاد رہے جہاد جس دعوت پر موقوف ہے، اس کے تین جملے ہیں: (۱) اسلام قبول کرلو (۲) جزیہ دو، اگر نہیں.... (۳) تو قتال کے لئے تیار ہو جاؤ! یہ دعوت بھی ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو کسی طور پر اسلام سے واقف نہ ہوں اور نہ انھوں نے اسلام کا نام سنا ہو۔ لیکن جن لوگوں کو ایک بار دعوت پہنچی ہے یا انھوں نے کسی نشریاتی ذریعے سے اسلام کا نام سنا ہے، ان کو دوبارہ میدانِ جہاد میں دعوت دینا صرف مستحب ہے۔

آج کل دعوت و تبلیغ کے نام سے جو ایک عمل چل رہا ہے اس کا دائرۂ کار صرف مسلمانوں میں ہے اور اصلاح و رہنمائی اور ترغیب تک محدود ہے۔ یہ وعظ و نصیحت و خیر خواہی ہے، جہاد والی دعوت نہیں ہے اور نہ جہاد والی دعوت کے ساتھ اس کی کوئی مشابہت ہے...

بہر حال جہاد کی یہ قسم اقدامی و ہجومی ہے جو فرضِ کفایہ کے درجے میں ہے، یعنی یہ جہاد دنیا بھر میں کہیں نہ کہیں ضرور ہونا چاہئے ورنہ ساری امت گنہ گار ہو جائے گی۔ گویا یہ ایک فریضہ ہے جو پوری امت کے ذمے ہے۔ جہاد کی دوسری قسم دفاعی ہے کہ کفار نے کسی اسلامی خطے پر حملہ کیا ہو اور مسلمان دفاع میں لڑ رہے ہوں، اگر وہ ناکافی ہوں تو رفتہ رفتہ

پوری دنیا کے مسلمانوں پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے جہاد کے لئے کوئی شرط نہیں.....

ایک ضروری بات یہ بھی سمجھ لیں کہ جہاد کی تعریف میں بعض علماء نے جہاد کی بعض انواع کا ذکر بھی کیا ہے یعنی جہاد کی ایک نوع جہاد بالمال ہے دوسری نوع جہاد باللسان ہے تیسری نوع جان سے جہاد کرنا ہے۔

غرض یہ ہے کہ جہاد باللسان وہ ہے جس سے میدانِ جہاد کا فائدہ ہو یعنی جہاد کی ترغیب ہو، تقریر ہو، فضائلِ جہاد کا تذکرہ ہو، جہاد سے متعلق جوشیلے اشعار ہوں اور جاندار نظمیں ہوں، کفار کو دھمکی ہو، للکار ہو۔ یہ جہاد باللسان ہے۔ نہ یہ کہ دو گھنٹے تقریر و بیان تو کھانے پینے اور پہننے کے آداب پر ہو اور پھر کہا جائے کہ میں نے جہاد باللسان کیا۔ یہ نیک کام تو ہو سکتا ہے لیکن جہاد باللسان نہیں۔ اسی طرح جہاد بالمال یہ ہے کہ آپ کے مال سے میدانِ جہاد اور مجاہدین کو فائدہ پہنچے نہ یہ کہ آپ نے کسی فقیر کو پیسہ زکوٰۃ ادا کیا اور پھر کہا کہ میں نے جہاد بالمال کیا، یہ نیک کام تو ہے لیکن جہاد بالمال نہیں۔ اسی طرح باقی اشیاء کو قیاس کر لیجئے کہ جان سے جہاد یہ ہے کہ اس جان کو میدانِ جہاد میں لگا دو اور اس مقدس عمل میں اسے کھپا دو۔ جہاد بالنفس یہ ہے کہ جس میں نفس واسطہ اور ذریعہ و آلہ بن جائے، اس میدان جہاد کے لئے! نہ یہ کہ میدانِ جنگ تو خواب میں بھی نہ دیکھا ہو اور کہتا پھرتا ہو کہ میں مجاہد ہوں، جہاد کر رہا ہوں۔ اور اگر ہر نیک عمل کرنے والے کو آپ مجاہدِ شرعی کہیں گے تو پھر یقیناً ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْراً عَظِيْماً﴾ کا مفہوم سمجھنا محال ہو جائے گا کہ مجاہد کا درجہ بیٹھنے والے کے مقابلے میں بڑا ہے، کیونکہ بیٹھنے والے بھی صحابہ کرامؓ تھے، جن کے اعمال سو فیصد صحیح تھے، تہجد گزار تھے، روزے دار تھے، ہر عبادت میں مشغول تھے، ان کو اس حالت میں مجاہدین کیوں نہیں کہا گیا، بلکہ مجاہدین سے اس وقت ان کو خارج کیوں کیا؟ اور صرف اُن کو مجاہد کیوں قرار دیا گیا جو کفار کے مقابلے میں نکلے تھے؟ معلوم ہوا کہ میدانِ جہاد میں جانے والا مجاہد ہوتا ہے، ہر عابد مجاہد نہیں ہوتا!

میرے بھائی اور میرے دوست! جہادِ شرعی کرنے والے کو مجاہد کہو۔ جہادِ لغوی یعنی کسی نیک محنت جس میں جہاد جیسا ثواب مل جاتا ہو، تو یہی غنیمت ہے کہ جہاد کے ثواب کی طرح ان کو ثواب حاصل ہو گیا۔ نہ یہ کہ وہ خود بخود مجاہد بن گیا کہ جہاز کے قریب بھی نہ گیا ہو اور پائلٹ بن گیا۔ آج کل تو اس مقدس لفظ (جہاد) کو کھیل تماشہ بنایا جا رہا ہے: کہتے ہیں کہ مچھر کے خلاف جہاد، ملیریا کے خلاف جہاد، ناخواندگی کے خلاف جہاد، مہنگائی کے خلاف جہاد وغیرہ وغیرہ۔ اور کبھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ امریکا کے خلاف جہاد، روس کے خلاف جہاد، ہندوستان کے خلاف جہاد، ہر سرکش، طاغوت، کافر، مشرک کے خلاف جہاد!

(جنگِ خندق، از مولانا فضل محمد ص ۱۳)

اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کی ''جمہوری'' تعبیر بھی عصرِ نو کا ایک بڑا المیہ ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جمہوری عمل عوام کی سوچ اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے عوام کی نمائندگی کا نام ہے۔ خواہشات کی یہ محبت عوام الناس کے لئے ایک پسندیدہ چیز بنا دی گئی ہے ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ (اٰلِ عمران: ۱۴) جب کہ جہاد اللہ کے کلمے کی سربلندی اور فتنے کے خاتمے کے لئے آگ و خون سے گزرنے اور قربانیاں دینے کا نام ہے اور یہ کام انسان کو طبعاً ناگوار ہے ﴿وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ (البقرة: ۲۱۶) اب بھلا لوگوں کو ان کی خواہشات کی تکمیل کی جدوجہد میں منہمک کرنا، اُن سے جان و مال کی قربانیاں لینے کی طرح کیسے ہو سکتا ہے؟ اور یہ بات تو عملاً بھی نظر آتی ہے کہ جمہوری عمل، اپنے شرکاء کے ''معیارِ زندگی'' کو بڑھاتا ہے، جب کہ جہاد فقر و قناعت کی آزمائشیں لاتا ہے۔ کہاں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس کی پیروی دنیا کی محبت کو دل سے نکالتی ہے اور کہاں مسلم معاشروں میں معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی خاطر چلائی جانے والی یہ جمہوری جدوجہد جس میں مادی ''ترقی'' اصلِ زندگی ہے، جہاں مفادات ہی وہ پیمانہ ہیں جس پر ریاست و جمہور کے تعلق کو پرکھا جاتا ہے، حاکم و محکوم کے درمیان یہی رشتہ ہے، قیادت اور عوام کے مابین یہی میثاقِ وفا ہے۔ جو اسے پورا کرے اُس کی حمایت کی جائے گی۔ جو عوام کی جھولی کو مراعات و سہولیات سے نہ بھر سکے اس کا عمل قابلِ اتباع نہیں۔ سارا جمہوری فلسفہ اور اس چھتری کے تحت قائم ادارے اور این جی اوز وغیرہ بھی

اسی ''عقیدے'' کے فروغ کا وسیلہ ہیں۔

حقیقت میں اس عمل کو ''انسانی بہبود'' وغیرہ کے خوشنما نام دے کر امت کو بڑے مقاصد سے دور کر دیا گیا ہے۔ اول تو یہ ساری ''فلاحی'' مہمات (لفظ فلاحی کا اس سے بڑھ کر غلط استعمال ممکن نہیں) بالاصل سرمایہ داری کے فروغ، مخالفتِ شرع اور اہلِ مغرب کی اقدار کی ترویج کے لئے ہوتی ہیں۔ تاہم اگر ''عوامی بہبود'' کے نام پر بظاہر وہ کوئی ''نیکی'' کر بھی رہے ہوتے ہیں تو اس ''خیر'' سے جو شر وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں فکرِ دنیا میں مشغول کر دیا جائے، ہم مادّی ''ترقی'' کی دوڑ میں مگن ہو جائیں، اور اُن مہمات سے مجتنب رہیں جو کفر کی سیادت کو دنیا میں چیلنج کرتی ہوں اور جن سے امتِ مسلمہ کے دفاع کا اہتمام کیا جا سکتا ہو۔

چند ارب ڈالر کے کھلونے (جنھیں ترقیاتی منصوبوں کا نام دیا جاتا ہے)، ان سے اگر اس امت دعوت کے قائدین، ''قاعدین'' بنتے ہوں، اس کے نوجوانوں کو ''متبادل'' مصروفیات مل جاتی ہوں، اس کی خواتین کو ﴿وَقَرۡنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ ''اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو'' کے بجائے، عوامی خدمت کے نام پر گھروں سے نکالا جا سکے، ہمارے بچوں کے لئے سیکولر مغربی تعلیمی اداروں کے جال پھیلائے جا سکیں... تو مغرب کے لئے نقصان کا ہے کا؟ جو کام ''کوڑوں'' سے نہ ہو سکیں، انھیں ''توڑوں'' سے حل کرنا اہلِ مغرب نے سیکھ لیا ہے۔ دل اور دماغ کو ڈالر کے ذریعے فتح کرنے کا یہ صلیبی و صیہونی منصوبہ پورے عالمِ اسلام میں جاری ہے۔ سودی ذرائع سے ہمارا ہی سرمایہ لُوٹ کر ہمیں ذلت کے نوالوں کی صورت میں کھلایا جا رہا ہے۔ ''سرمایہ'' یہود و نصاریٰ ہمیں پہلے بھی دیتے تھے، لیکن جزیے کی صورت میں، اُس دور میں جب خلافت قائم تھی، شریعت غالب تھی، اور اس طور دیتے تھے کہ... ''عَنۡ يَدٍ وَهُمۡ صَاغِرُونَ'' ''اپنے ہاتھوں سے اور ذلیل ہو کر''، اور فقہائے کرام کے بقول: اس حکمِ الٰہی کو پورا کرنے کے لئے کسی ذمّی کو ملازم کے ذریعے اسے بھیجنے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ وہ خود آئے گا اور اس حالت میں جزیہ ادا کرے گا کہ وہ کھڑا ہوگا اور وصول کرنے والا مسلمان بیٹھ کر وصول کرے گا۔

مسلم معاشروں میں ''مغربیت'' کی علمبرداری کرنے والے مادی ترقی کی مہمات کو بڑی عبادت

قرار دے کر، مسلمانوں کو سرمایہ داری نظام کے کارندے بنا کر شعوراً یا لاشعوراً انھیں اپنے دفاع اور جہاد جیسی عظیم الشان عبادت سے دور رکھ رہے ہیں۔ کفر کی یلغار اور فتنوں سے بے پروا ہو کر، مسائل کے حل کی جدوجہد اور ''سہولیات'' کی فراہمی کی مہمات میں زندگیاں پگھلا دینا ایسے ہی ہے جیسے ہم سانپوں سے بے پروا ہو کر جنگل سے پھول چننے لگ جائیں۔ ظاہر ہے سانپوں کی خوشی بھی اسی میں ہے لیکن اس کا کیا کیجئے کہ پھولوں نے مرجھانا ہے، سانپوں نے اپنی روش ترک نہیں کرنی، اور خود جنگل نے ایک دن چٹیل میدان بن جانا ہے! پھر اس سب کچھ کا حتمی نتیجہ "خَسِرَ الدُّنيا وَالْاٰخِرَةَ" کے سوا اور کیا نکلے گا؟

اگر لوگوں کو ''ترقی'' دلانا، ان کے مادی مسائل حل کرنا، اُن کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہی جہاد ہوتا تو اسلام کے عہدِ زرّیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ءکرامؓ بنونضیر و قریظہ سے نمٹنے اور تبوک و طائف کے معرکے سر کرنے کے بجائے (معاذ اللہ) ایسا لائحہ عمل دیتے کہ جس میں پہلے مدینے کی گلیوں کو کشادہ و ہموار کیا جاتا، چوراہوں میں قمقمے اور مشعلیں روشن ہوتیں، سڑکوں اور پلوں کی افتتاحی تقریبات منعقد کی جاتیں، تجارتی میلوں کو فروغ ملتا، اور کچھ نہیں تو کم سے کم مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ستونوں اور فرش ہی کو پختہ کر لیا جاتا!

ایمان کی اُس مثالی بستی میں اگر کوئی ضروری انتظامی کام ہوئے بھی تو معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے نہیں ہوئے۔ ہوئے بھی تو طاغوتوں کے سودی قرضوں کی بنیاد پر نہیں ہوئے، یہود و نصاریٰ کی مشاورتوں اور تربیتی 'ورک شاپوں' کے زیرِ سایہ نہیں ہوئے، کفار کو اپنے برابر کی کرسیوں پر بٹھا کر نہیں ہوئے، نہ ہی ایسے عالم میں ہوئے کہ 'اسلام' اور اس کے قوانین مغلوب ہوں، مسلم سرزمینوں پر صلیبیوں اور صیہونیوں نے لشکر کشی کر رکھی ہو، مسلمان قیدیوں سے کفار کے عقوبت خانے آباد ہوں، یہود ارضِ مقدس پر قابض ہوں۔ بلکہ یہ ناگزیر انتظامی کام تب ہوئے جب معلوم دنیا کا دوتہائی حصہ اسلام کے قبضے میں تھا، اللہ کا دین غالب تھا، اسلامی سرحدیں محفوظ و مامون تھیں اور دنیا میں کوئی ایک مسلمان ایسا نہ تھا جسے کافروں نے کمزور پا کر دبا رکھا ہو۔

آج جب کہ ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمان سب کے سب مستضعفین کی سی زندگی گزار رہے ہوں،

اسلام کے قوانین صرف کتابوں میں ہوں، ہمارے بارے میں پالیسیاں سات سمندر پار سے بن کر آتی ہوں، ایوانوں میں شریعت کے سوا ہر ''بھلائی'' پر بات ہوسکتی ہو، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی برابر کی نشستوں پر بیٹھ کر ملت کے فیصلوں میں شریک ہوتے ہوں، این جی اوز اور ملکی و غیر ملکی اداروں کو ہر کام کی کھلی چھٹی ہو... ایسے میں ''تعلیم'' کے نام پر مغربی سیکولر اداروں کا کھل جانا، اطلاعات کی ''اہمیت'' کے پیشِ نظر کمپیوٹر نامی ایک آلے کے ذریعے گلی گلی قحبہ خانوں کا پھیل جانا، ''بہبودِ آبادی'' کے نام پہ نسل کُشی کی مہمات کا عام ہوجانا، ''ترقیات'' اور امداد کے نام پر بین الاقوامی سودی جال میں الجھ جانا عجیب نہیں لگتا۔ عجیب یہ لگتا ہے کہ اسے ہی جہاد قرار دے دیا جائے! ساری توانائیاں اور وسائل انھیں مہمات میں غرق ہوکر رہ جائیں جب کہ امت کے دفاع کی خاطر مورچوں میں بیٹھے لوگ نہتے پڑے رہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ کے شرعی معنی کا شعور ہی ہمیں اس فریضے کی ادائیگی کا پابند بنا سکتا ہے ورنہ تو ہم کسی بھی کام کو جہاد قرار دے کر اس عظیم فریضے سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ اگر صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جہاد کے اسی مفہوم پر اکتفا کیا ہوتا اور آگ و خون کے دریاؤں کو عبور نہ کیا ہوتا تو بلاشبہ یہ دین مدینہ منورہ کی حدوں کو عبور نہ کر پاتا، بلکہ (معاذ اللہ) اس کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ یہ جہاد ہی کا میدان تھا جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (بدر کی گھاٹی میں) روتے گڑگڑاتے اپنے ربّ سے یہ دعا کی کہ: ((اَللّٰھُمَّ اِنْ تَھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃُ الْیَوْمَ لَا تُعْبَدْ، اَللّٰھُمَّ اِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْیَوْمِ اَبَدًا)) ''اے اللہ! اگر آج یہ گروہ ہلاک ہوگیا تو تیری عبادت نہ کی جائے گی۔ اے اللہ! اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت کبھی نہ کی جائے''۔ (الرحیق المختوم، ص ۲۹۶)

پس امت کے رہبروں کو چاہیے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کو ایسے معنی نہ دیں کہ نسلِ نو میدان ہائے کارزار کو بھلا بیٹھے۔ بلکہ انھیں چاہیے کہ مسلمانوں کو اس گم گشتہ فریضے پر اُبھاریں کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے: ﴿وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (النساء: ۸۴) ''اور اہلِ ایمان کو (جہاد پر) ابھارو''۔

۷۔ دشمن کے حملے کی صورت میں، دفاعی جہاد وقت کا اہم ترین فرض ہوتا ہے

یہ شوال ۳ سنِ ہجری کا واقعہ ہے۔ دشمن مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہونے کو ہے۔ اسلام کا مرکز خطرے کی زد میں ہے۔ مسلمانوں کی اُس بستی میں نماز روزے سمیت ہر طرح کے فرائض کی بجا آوری جاری ہے۔ اس بستی کی مسجد میں پڑھی جانے والی ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ لیکن اب سب مسلمان دفاعِ دین وملت کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں، کیونکہ وقت کا اہم ترین تقاضا یہی قرار پایا ہے۔

ایسے میں ایک آدمی زرہ بند ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے: ''اُقَـاتِلُ اَوْ اُسْلِمُ؟'' ''میں قتال کروں یا اسلام لاؤں'' حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جواب ملتا ہے: ''اَسْـلِـمْ ثُـمَّ قَـاتِلْ!'' ''اسلام لاؤ پھر قتال میں شریک ہو جاؤ''۔ چنانچہ وہ شخص اسلام لایا، پھر جنگ میں شریک ہوا اور شہید ہو گیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عَـمِلَ قَلِيْلاً وَاُجِرَ كَثِيْراً''۔ ''عمل کم کیا لیکن اجر بہت پایا''۔ (رواه البخاري في كتاب الجهاد)

یہ وہی انصاری صحابی عمرو بن ثابتؓ ہیں جن کے بارے میں حضرت ابو ہریرۃؓ فرمایا کرتے تھے کہ ''أخبروني عن رجل دخل الجنة لم يصل صلاة'' ''مجھے اُس آدمی کا (نام) بتا سکتے ہو، جس نے ایک نماز تک نہ پڑھی پھر بھی وہ جنت میں داخل ہو گیا؟'' (فتح الباري ج ٦ ص ٢٥)

اُحد کے دن جب دشمن اسلام کی سرزمین پر حملہ آور ہوا تو اُس صحابیؓ سے ایمان لانے کے بعد نہ تو نماز کی ادائیگی کا فوری تقاضا کیا گیا، نہ روزے زکوٰۃ کی بات کی گئی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہی حکم دیا کہ میدانِ قتال میں کود پڑو کیونکہ دیگر تمام عبادات سے بڑھ کر اُس موقع کا اہم ترین فرض یہی تھا کہ حملہ آور دشمن کے خلاف دفاع کیا جائے تا کہ ایمان اور اہل ایمان کو کفر کی یلغار سے بچایا جا سکے، اسلام کی بنیادوں: کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، نماز، روزے اور دیگر شعائر کی حفاظت ہو سکے۔

شیخ عزامؒ کی کتاب'' الدفاع عن أراضي المسلمين أهم فروض العيان بعد الايمان'' ''ایمان کے بعد اہم ترین فرضِ عین حملہ آور دشمن کے خلاف دفاعی جہاد (اور مقبوضہ مسلم سرزمینوں کی

بازیابی)'' جہاد کی اسی دوسری قسم کے احکامات پر مبنی ہے۔ جہاد کی یہ قسم دفاعی جہاد کہلاتی ہے۔ دفاعی جہاد فرضِ عین یعنی ہر مسلمان پر فرض ہوتا ہے۔ جب دشمنانِ اسلام مسلمانوں کی سرزمینوں کی طرف بڑھیں (یا محض بڑھنے کا ارادہ کریں) تو سب پر یہ لازم ہوتا ہے کہ کفر کے ان ناپاک ہاتھوں کو روکنے کے لئے پیسہ اور جان لگائیں۔

امام ابن عابدینؒ نے اپنے حاشیے کی جلد ۳ صفحہ ۲۳۸ پر لکھا ہے: ''اور اگر دشمن کسی اسلامی سرحد پر حملہ آور ہو تو جہاد نماز اور روزے کی طرح فرضِ عین ہو جاتا ہے جن کو چھوڑنے کی گنجائش نہیں''۔ (بحوالہ ''دیکھنا قافلہ چھوٹ نہ جائے'' از عزامؒ)۔

پھر اپنی اسی کتاب میں آگے چل کر شیخ عزامؒ لکھتے ہیں ''اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو والدین سے اجازت لینا ضروری نہیں رہتا۔ بالکل اسی طرح جیسے نماز کی ادائیگی یا روزہ رکھنے کے لئے اُن کی اجازت ضروری نہیں ہوتی''۔ اور یہ بھی کہ ''کسی عذر کے بغیر جہاد کے فرضِ عین کو چھوڑنے والے اور رمضان میں بغیر عذر کے روزہ نہ رکھنے والے میں کوئی فرق نہیں''۔

اسلام کے سنہری دور کی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب بھی کفر نے اسلام اور مسلمانوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا، اہلِ اسلام نے پوری دستیاب قوت استعمال کر کے اس حملے کا دفاع کیا اور امت کے بہترین لوگ اور نادرِ روزگار ہستیاں اسلام کے مورچوں میں پائی گئیں۔ اُحد و خندق اور تبوک وغیرہ کے غزوات اور بعد کے ادوار کی سیکڑوں جنگی مہمات اس کی واضح مثالیں ہیں۔

دفاعی جہاد کی یہ اہمیت مسلمانوں پر ہمیشہ اس قدر واضح تھی کہ کبھی کسی کے ذہن میں اس کے شرعی حکم کے حوالے سے ابہام پیدا نہیں ہوا۔ ہر مسلمان یہ جانتا تھا کہ ایسی حالت میں سب کو نکلنا ہے، بہر حال (ہلکے ہوں یا بوجھل) نکلنا ہے اور میسر وسائلِ دفاع کے ساتھ کفر کا مقابلہ کرنا اور اسے پچھاڑنا ہے۔ ایسے مواقع پر تربیت، اور ایمان کے درجوں میں تفاوت کی بھی کوئی شرط نہ تھی، لہٰذا وہ بھی نکلے جو برسوں صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف یاب رہے تھے اور وہ بھی جو عین میدانِ جنگ میں ایمان لائے اور ایک نماز بھی نہ پڑھ پائے تھے۔ مالی جہاد کی اہمیت بھی واضح تھی۔ کوئی اپنے گھر کا پورا سامان کھپا کر اور کوئی چند سیر اناج خرچ کر کے اس جہاد میں شریک ہوتا (کیونکہ اس سے زیادہ اس کے بس

میں نہ ہوتا تھا)۔اسی یکسوئی کا نتیجہ تھا کہ اسلام پر حملہ ناممکن اور مسلمانوں کی تذلیل بعید از امکان تھی۔اس کے برعکس آج دنیا میں اسلام کے وقار اور مسلمانوں کی حرمتوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنے اس اہم ترین فرضِ عین سے غافل ہیں۔امت کے پیشواؤں، قائدین، مفکرین اور اہلِ علم سے یہ صورتِ حال سوال کناں ہے کہ اسے ذلت کے اس گڑھے سے نکالنے کے لئے انھوں نے کیا کیا؟

تو اِدھر اُدھر کی نہ بات کر، یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا؟

مجھے رہزنوں سے غرض نہیں، تری رہبری کا سوال ہے!

کیا اس گُم گشتہ فریضے کی طرف دعوت دینے کی، انسانی و مالی وسائل کو اس جانب لگوانے کی نوبت اب بھی نہیں آئی جب کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مصداق اقوامِ کفر ایک دوسرے کو مسلمانوں پر حملے کی دعوت اس طرح دے رہی ہیں جس طرح بھوکے دسترخوان پر ایک دوسرے کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔انھوں نے خلافتِ عثمانیہ کے ٹکڑے کر دیئے، دنیائے عرب کی ایک ایک ریاست کو اپنا باج گزار بنا لیا، تھائی لینڈ، فلپائن، اراکان سمیت برعظیم اور اس کی کئی مسلم ریاستوں کو ہڑپ کیا، ماوراءالنہر ترکستان کی مسلم مملکتیں اپنے کروڑوں اہلِ ایمان سمیت اشتراکیوں کے لئے لقمہء تر بن گئیں۔ وہاں لاکھوں لوگ پہلے ہی صلیبی بنا دیئے گئے تھے، باقی ماندہ کروڑوں مرد وزن اشتراکی اور دہری عقائد کے شکار ہو گئے، مشرقی ترکستان کو چینی طاغوت نے نگل لیا۔ پھر غلامی و ذلت کے اس سفر میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سرزمین فلسطین ہم سے چھینی گئی، بلقان کے ممالک اشتراکی و عیسائی سربریت کا شکار ہوتے رہے۔مسجدوں کی دھرتی بوسنیا، اجتماعی قبروں کی زمین بن گئی۔ادھر کشمیر مشرکین کی غلامی میں چلا گیا، افغانستان کی امارتِ اسلامیہ ہاتھ سے جاتی رہی اور کابل کے پایہء تخت پر یورپی و امریکی صلیبی قابض ہو گئے۔اسلامی عظمتِ رفتہ کی یادگار... دارالخلافہ بغداد، صلیبیوں کی چراگاہ بن گیا۔یہی نہیں بلکہ اب تو پورے عالمِ اسلام میں جا بجا صلیبی فوجی اڈوں کا جال بچھ چکا ہے اور پوری امتِ اسلامیہ عملاً اُن کے شکنجہء قہر میں ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ امریکہ سے باہر، سب سے بڑا امریکی فوجی اڈہ کہیں اور نہیں بلکہ

جزیرۃ العرب... جزیرۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ملک (قطر) میں ہے اور صلیبی فوجیں کعبۃ اللہ سے صرف ۴۵ میل پر اپنا اڈہ بنا کر مورچہ زن ہیں! کہاں ہیں دعوتِ دین کے علمبردار اور اتباعِ سنت کے داعی؟... کیا ان کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہیں آتا: ((لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا أَدَعَ إِلَّا مُسْلِمًا)) (مسلم، کتاب الجهاد، باب إخراج اليهود والنصارى من جزيرة العرب) ''میں ضرور بالضرور یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال کر دم لوں گا یہاں تک کہ مسلمان کے سوا کسی کو باقی نہیں چھوڑوں گا''۔

ابھی تو آئمۃ الکفر سے اُن زخموں کا حساب بھی باقی تھا جب ۱۸۵۷ء میں ہمارے ستائیس ہزار علماء وشرفاء دلی کے چوکوں میں پھانسیوں پر لٹکائے گئے، جب ہمارے تین لاکھ کلمہ گو تاجِ برطانیہ کی ''عظمت'' کی بحالی کی مہم کی نذر ہوئے اور آج سے پانچ سو سال پہلے سقوطِ اندلس کے موقع پر یورپی صلیبیوں نے جس طرح مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا، اور لاکھوں لوگوں کو قتل کرکے، باقیوں کو جس طرح بپتسمہ دے کر عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، وہ زخم تو قیامت تک بھلائے نہ جا سکیں گے۔ امام عبداللہ عزام شہیدؒ نے لکھا ہے کہ پانچ سو سال سے اندلس کفار کے قبضے میں ہے، تب سے اب تک، اسے کفار کے قبضے سے نہ چھڑانے کا گناہ مسلمانوں کی گردنوں پر موجود ہے۔

یہ تو ایک اندلس کا معاملہ ہے، جب کہ آج تو بلادِ اسلامیہ کے شرق وغرب میں نئی اندلس نظر آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے ساتھ مسلسل یہ سب کچھ کیوں ہو رہا؟ اس لیے کہ ہم ایمان تو لے آئے لیکن اس کی حفاظت کے لئے نہ اٹھے، نہ ہی دین و دنیا پر حملہ آور ہونے والے دشمن کو پچھاڑنے کی کماحقہٗ سعی کی۔ اور اگر ہم میں سے کوئی اٹھا بھی تو باقی مسلم دنیا نے اسے اٹھنے والوں کا مقامی مسئلہ سمجھا اور دوسروں سے یہی کہا کہ ابھی تم پر فرضِ عین نہیں ہوا، جو پٹ رہے ہیں صرف انھی پر فرضِ عین ہے۔ نتیجتاً ایک ایک کر کے سارے بلادِ اسلام کفر کے شکنجے میں چلے گئے، شعائرِ اسلام مٹتے رہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ جب کہ کفار ملتِ واحدہ بن کر ایک دوسرے کے معین و مددگار ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ﴾ (الأنفال: ۷۳) ''اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں،

اگر تم یوں نہ کرو گے (یعنی اہلِ ایمان سے رفاقت نہیں نبھاؤ گے) تو ملک میں فتنہ پھیلے گا اور بڑی خرابی ہوگی''۔

سچی بات یہی ہے کہ اگر امتِ مسلمہ نے ان جارح ممالک اور اقوام کے خلاف، بھرپور انداز میں اپنی دفاعی ذمہ داریاں نبھائی ہوتیں تو آج صورتِ حال بہت مختلف ہوتی، اور دشمن کب کا ان علاقوں سے نکل گیا ہوتا۔ اور اسلام کے خلاف کافروں کی جو جرأت آج ہمیں نظر آتی ہے وہ نہ ہوتی۔

شریعتِ محمدیؐ کو ایک طرف رکھ کر سوچنے والے رائے پرست تو یہی کہیں گے کہ کیا کریں ہمارا اُن کا مقابلہ ہی نہیں؟ سائنسی ترقی اور ایجادات میں کفار کی برابری کیے بغیر اُن سے نمٹنا ناممکن ہے! ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا فارس و روم جیسی، اپنے وقت کی جابر قومیں سائنسی ترقی اور ایجادات کے زور پر مسلمانوں سے مغلوب ہوئی تھیں؟؟ ہمارے لئے مثال ہر حال میں مدینۃ النبیؐ کی وہ کچی بستی ہی ہے جس نے قیصر و کسریٰ جیسے طاغوتوں کے دانت کھٹے کردیئے، نہ کہ قرطبہ جیسے شہر جن کے فنِ تعمیر کے نادر نمونے، علوم وفنون کی کرشمہ سازیاں دفاعِ اسلام کے کچھ کام نہ آسکیں اور یہ سرزمینیں پھر بھی ہم سے چھین لی گئیں اور آج یہ بستیاں نمونہء عبرت کے سوا کچھ نہیں۔ الغرض ہمارا مسئلہ ''وسائل کی کمی'' نہیں، بلکہ ان ہاتھوں کی کمی ہے جو میسر وسائل کو استعال میں لائیں، اُن ذہنوں کی کمی ہے جو فرضِ مقدم کو پہچانیں، اُن دلوں کی کمی ہے جن میں اللہ کے سامنے جواب دہی کا خوف ہو...اُن آنکھوں کی کمی ہے جن سے نکلنے والے آنسو... محض آنسو نہ ہوں بلکہ وہ بغداد و فلسطین، اور کشمیر و شیشان میں بہنے والے خونِ مسلم کا مداوا بھی بن سکیں، جو ناموسِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر صرف باتیں نہ بنائیں، کچھ کر کے بھی دکھائیں!

آج ہمارے پڑوس افغانستان میں عالمی کفر کی افواج موجود ہیں اور امریکی قبضے کو مستحکم بنائے ہوئے ہیں۔ امارتِ اسلامیہ افغانستان پر نیٹو، ایساف وغیرہ کے قالب میں کیا جانے والا صلیبی حملہ، امریکہ و یورپ کی طرف سے اسلام پر مسلط کردہ جنگ کا اہم ترین محاذ ہے۔ اس لئے کہ اسلام کی محبت، شریعت کی تنفیذ اور عالمِ اسلام کے مہاجرین کی میزبانی مسلمانانِ خراسان کے وہ ''جرائم'' ہیں جو عالمی کفر کی ہزیمت کا سامان بن گئے۔ امریکہ اور برطانیہ سمیت کل ۳۶ کے قریب ممالک جو نیٹو اور

اس کے اتحادی ہیں ، افغانستان پر امریکی قبضے میں شریک ہیں۔ یہ دراصل ایک بڑی مہم کا حصہ ہے۔اُن کا ہدف صرف وہ جری افغان قوم ہی نہیں جس نے دس سال تک روسی عفریت کا مقابلہ اپنی حمیتِ ایمانی کے بل پر کیا،اور سرخ ریچھ کو گھر سے بے گھر کیا، بلکہ ان کی پڑوسی میزبان قوم بھی ہے جس نے اُن کے لاکھوں مہاجرین کو پناہ دی ، وہی قوم جس نے لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر ایک ملک تشکیل دیا، جو ایک جانب مغرب میں عالمی صلیبی اتحادیوں کے لشکر سے، مشرق میں ہنود سے، شمال میں دہریوں سے اور جنوبی پانیوں میں ''عظیم تر اسرائیل'' کے محافظوں سے گھری ہوئی ہے، جو ہر محاذ پر اغیار کی اسلام دشمنی کا تختہء مشق بنی ہوئی ہے لیکن پھر بھی سمجھتی ہے کہ ''ہماری باری نہیں آئے گی!''

اسی طرح اُن کے پیشِ نظر کشمیری قوم کو جہاد کے راستے سے ہٹانا بھی ہے جس نے پندرہ سال تک اپنے ایک لاکھ مرد وزن، بت پرستوں سے مقابلے کے لئے اللہ کی راہ میں قربانی کے لئے پیش کر دیئے۔

اس وقت اسلامی امارتِ افغانستان پر حملے اور قبضے میں شریک زیادہ تعداد تو امریکہ، برطانیہ، جرمنی، اٹلی ، کینیڈا اور فرانس کی فوجوں کی ہے لیکن دیگر ؛ آسٹریا ، بیلجیم ، کروشیا، چیک ری پبلک، ڈنمارک، ایسٹونیا، فن لینڈ، مقدونیہ (سابقہ یوگوسلاویہ) ، یونان ، ہنگری ، آئس لینڈ، آئرلینڈ، لیٹویا، لیتھونیا، لیگزمبرگ، ہالینڈ، نیوزی لینڈ، ناروے، پولینڈ ، پرتگال، رومانیہ، سلوواکیہ، سلوینیا، سپین، سویڈن اور سوئیٹزرلینڈ بھی شامل ہیں۔امریکہ کے بالمقابل یورپ کو اپنا ''ہمدرد'' سمجھنے والے سادہ لوحوں کو اس فہرست پر ایک بار ضرور غور کر لینا چاہیے۔ حقیقت میں مغرب افغانستان میں اپنی تہذیب کے بقا کی جنگ لڑ رہا ہے، لیکن پسپائی اس کا مقدر ہے، ان شاء اللہ، **واللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر**۔

اُدھر ان میں سے بیشتر صلیبی اقوام عراق میں بھی اسلامیانِ امت کے خلاف پوری یکسوئی سے برسرِ پیکار ہیں۔ یہاں ان کی کل تعداد تقریباً ۲۶ ہے۔مشرقی یورپ کی صلیبی اقوام کے ساتھ ساتھ جاپان جیسا ''غیر عسکری'' ملک بھی اس جنگ میں صلیب کے مورچوں میں ہے، جب کہ چین بظاہر مغرب مخالف ہوتے ہوئے بھی ہر قراردادِ ظلم میں عالمی کفر کا شریک ہوتا ہے۔صلیبی جنگ کا ایک مشرقی محاذ شیشان میں کھلا ہوا ہے۔اور یہ تو دشمن کے وہ مورچے ہیں جو سب کی نگاہوں میں ہیں، لیکن

وہ یلغار جو تعلیم، اقتصاد، ابلاغیات، ثقافت، افکار اور تعلقاتِ عامہ سمیت دوسرے خفیہ محاذوں پر جاری ہے اُس کا احساس کتنوں کو ہے؟ اور کتنے اس کے مقابلے کے لئے تیار ہیں؟

مشکل کی اس گھڑی میں مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنوں کی بے اعتنائی کے باوجود اسلام اور مسلم سرزمینوں کا دفاع کر رہے ہیں، ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے پروا اپنے سروں کی فصلیں کٹائے جا رہے ہیں، امت کو ذلت کے گڑھے سے نکالنے کے لئے خود اپنی توہین برداشت کر رہے ہیں۔ دنیاوی زندگی کے ان جھمیلوں، قبر کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں، اور قیامت کی ہولناکیوں میں اللہ کی معیت ان کے ساتھ ہے، فرشتے ان کے دوست ہیں ان شاء اللہ، اور یہ سب مشقتیں دنیا و آخرت میں ان کے خوب کام آئیں گی کیونکہ یہی تو وہ لوگ ہیں جو سب سے بڑھ کر اپنے مالک کی رحمت کے امیدوار ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (البقرة:۲۱۸)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ بخشنے والے، مہربان ہیں''۔

اللہ عزوجل کی رحمت کے طلب گار یہ لوگ دنیا میں دعوتِ اسلام کی سربلندی کے خواب دیکھنے والے ہیں۔ ایک ایسا خواب جس کی تعبیر پر ہمارا یقین اُس سے کہیں زیادہ ہے جتنا یقین ہمیں کل کے سورج کے طلوع ہونے پر ہے! سچ یہ ہے کہ وہ امت جس کا مقصدِ وجود بطور امت ہے ہی یہ کہ اس دنیا سے منکر کو ختم کرے، نیکی کا چلن عام کرے وہ اپنے اساسی فریضے سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اُس کے سبھی وابستگان کو گھوم پھر کر اُسی لائحہ عمل کی طرف آنا ہے جو ازل سے اس کے لئے مقرر ہے:

﴿ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (اٰل عمران:۱۱۰)

''تم عالم میں بھیجی گئی سب امتوں سے بہتر ہو۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو''۔

اللہ ربّ العزت نے اس امت کو چنا ہی اس کام کے لئے ہے، یہ اس امتِ توحید کا عالمگیر ہدف ہے جس کا حصول ایک مسلسل عمل ہے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح مبشرات پر ہمارا ایمان ہے۔حق کا غلبہ حق ہے۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکین کی تہذیبیں اوران کا بنایا ہوا عالمی جبر کا ڈھانچہ، یہ سب دنیا سے مٹ جائیں گے۔ یہ وہ گرتی ہوئی دیواریں ہیں جن کا فکری اور عملی سہارا لینا، اُن سے مکالمہ کرنا، چاہے یہ مکالمہ بین المذاہب ہم آہنگی کے نام پر ہو یا بقائے باہمی کے سفید پرچم تلے، دراصل جاہلی اقدار کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنا ہے۔ باطل افکار کے ان سایوں کا انجام بھی دیواروں کے ساتھ مقدر ہے۔ ''اگر آپ ہمارے معبودوں کو قبول کرلیں تو ہم بھی آپ کے خدا کی عبادت کریں گے''، اور ''ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہا جائے''... جاہلیت کا قدیم مطالبہ ہے۔ وہی جاہلیت آج مغربی اقدار وتہذیب کا زیور پہن کر، پھر ہمارے سامنے نمودار ہوئی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم اس کی برتری کو قبول کرلیں؛ اسلام کے بجائے جمہوریت ہماری اساس، شریعت کے بجائے سرمایہ داری ہمارا طریقِ زندگی، قرآن کے بجائے انسانی دساتیر ہمارا لائحہ عمل، دینی اخوت کی جگہ ''انسانیت'' ہماری پہچان، اور بیتِ کعبہ کے بجائے بیتِ ابیض ہمارا معنوی اور عملی قبلہ بن جائے۔ اس ساری جاہلیت کے مقابلے میں بحیثیت مسلمان ہمارا جواب وہی ہے جو ہمارے رازق نے ہمیں تعلیم فرمایا ہے، اور جسے ہم اپنے (واحد) سچے صحیفے میں لکھا ہوا پاتے ہیں:

﴿ قُلْ يَآيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّم ۝ وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝﴾ (سورۃ الکٰفرون)

''آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! نہ میں عبادت کرتا ہوں اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو، نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں عبادت کروں گا اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کررہا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین''۔

اللہ کا یہ سچا دین توحید کے اقرار اور شرک سے انکار کی اساس پر قائم ہے۔ اس دعوت کی سربلندی

مطلوب ہے۔ توانائیوں کا راہِ مقصود میں کھپنا، اموال کا اہدافِ منصوص میں لگنا عقل مندی کی دلیل ہے۔ آگ جب بھڑک اُٹھے تو اس کا بجھانا ہی وقت کا اہم ترین ہدف ہوتا ہے، اس میں کودنے والے بھلے تنہا ہی ہوں " یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا " "اے آگ سرد ہو جا اور سلامتی بن جا" کی صدا سنتے رہتے ہیں، بے گھر کیوں نہ ہوں "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے" کا وعدہ انھیں رُکنے نہیں دیتا، کیونکہ مالک نے ان کے رستے کے ساتھ "فی سبیل اللہ" کی خوشخبری منسلک کی ہے۔ چلنے والے کو اس راہ پر اللہ ملتا ہے، اس تک پہنچنے کا ایک نہیں سبھی راستے نظر میں آ جاتے ہیں... " لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" "ہم ضرور بالضرور ان کو اپنے رستے دکھا دیں گے"....

پس اے اللہ کے مددگارو! تنہائی میں گھبرانا مت اور مشکل میں اداس نہ ہونا! کہ تمہارے اس قافلے کی نسبت امام المجاہدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، آپ ہی کے نقوشِ پا ہیں جن کو تم نے سنگ ہائے میل کہا ہے، آپ ہی کی ہدایات ہیں جن کو تم نے قابلِ اتباع جانا ہے، آپ ہی کے فیصلے ہیں، جنھیں تم نے قبول کیا ہے۔ اگر یہ نقوشِ پا، یہ ہدایات اور یہ فیصلے تم نے سچے دل سے قبول کیے ہیں تو سُن لو کہ پھر تمہارے لئے اُن کی جانب سے خوشخبریاں اور تمہاری راہ کے بالعکس، دنیا پرستی اختیار کرنے والوں کے لئے وعیدیں ہیں:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ وَ عَبْدُ الْخَمِيْصَةِ، اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَ سَخِطَ، تَعِسَ وَانْتَكَسَ، وَ اِذَا شِيْكَ فَلَا انْتَقَشَ ،طُوْبٰى لِعَبْدٍ اٰخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَشْعَثَ رَأْسُهٗ، مُغْبَرَّةٍ قَدَمَاهُ، اِنْ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ، وَاِنْ كَانَ فِي السَّاقَةِ كَانَ فِي السَّاقَةِ، اِنِ اسْتَأْذَنَ لَمْ يُؤْذَنْ لَهٗ وَ اِنْ شَفَعَ لَمْ يُشَفَّعْ)) (بخاري كتاب الجهاد، باب الحراسة في الغزو في سبيل الله)

"تباہ ہو جائے دینار کا بندہ اور درہم کا بندہ، اور کمبل (چادر) کا بندہ۔ اگر اُسے دیا جائے تو خوش اور نہ دیا جائے تو غصے! تباہ ہو جائے اور منہ کے بل گرے! اور اگر اسے کانٹا چبھے تو (اللہ کرے کہ) نہ نکلے۔ مبارک ہو اس بندے کو جو اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ

تھامے ہوئے ہو، بال بکھرے اور گرد آلود پاؤں! اگر اسے پہرے پر لگا دیا جائے تو پہرا دے، اور اگر پچھلے لشکر میں چھوڑ دیا جائے تو پچھلے لشکر ہی میں رہے۔ اگر اجازت مانگے تو اجازت نہ ملے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش نہ سنی جائے''۔

پس مبارک ہو اے قافلہء نور کے شہہ سوارو! کہ تمہارا راستہ قابلِ رشک ہے۔ غربتِ اسلام کے اس دور میں تمہاری آنکھیں اہلِ دنیا کی چکا چوند سے مرعوب نہ ہو جائیں۔ تم عمل کی دنیا میں اُس ہستی کے وارث ٹھہرے جس نے دمِ رخصت، جب کہ گھر کا اناج بھی رہن پر لیا گیا تھا، کئی چمکتی تیز دھار تلواریں اپنے در و دیوار پر لٹکتی چھوڑی تھیں، علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ مبارک ہو کہ تم اس دنیا میں قافلہء حجاز کی جانشینی کے اور اُس جہان میں سالارِ قافلہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نشینی کے برحق امیدوار ہو! وحَسُنَ اولئک رفیقًا.

اے ساتھیو! اپنے اخلاص کو پرکھو، اپنے نصیب کو جانچو، تقویٰ کو اپنا امام بنالو ﴿اتَّقُوا اللّٰہ﴾ اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ ﴿وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ ناموں کی تختیاں مت پڑھنا کہ یہ آئے روز بدلتی رہتی ہیں، کاموں کی فہرست کو جانچنا کہ یہ تاریخ میں ثبت ہو جاتے ہیں، دشمن کی حقیقت کو سمجھنا، دوستوں کی تلاش آسان ہو جائے گی! دیکھو! سبیل اللہ کو ٹھکرانا آخرت کے کسی سچے راہی کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ جس نتیجے پہ بہت سے لوگ آئندہ پہنچیں گے، تم اس پہ آج پہنچ جاؤ!

سنو! وقت نے ہمیشہ ثابت کیا ہے کہ وحی کا کامل اتباع ہی ہر دور میں کشتیٔ نوح ہوتا ہے۔ اس سے باہر کتنی ہی بلند چوٹی ہو، پانی کو اُس تک پہنچنا ضرور ہے۔ پھر کشتی سے دور رہنے کا فائدہ؟ اسلام کے کوہان کی چوٹی ''ذروۃ سنامہ'' کو اختیار نہ کرنے سے حاصل؟

دیکھو! یہ سبیل اللہ ہے! اللہ کا راستہ ہے! بہت شفاف، بہت واضح! توحید کے نام لیوا قافلہ در قافلہ اِس پر نکلتے رہیں گے، نور کی یہ شاہراہ آباد رہے گی، جنوں کی کھیتیاں پکتی رہیں گی، سروں کے سودے ہوتے رہیں گے۔ سُود و زیاں کے زائچے وہ بنائے جس کے لئے دنیا اہم تر ہو، جس کا بھروسہ وسائل پر ہو، لیکن جس نے تفویض و توکّل کا ذائقہ چکھ رکھا ہو، جو ﴿اُفَوِّضُ اَمْرِیٓ اِلَی

اللّٰہِ﴾ ''میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں'' کا اقرار کرتا ہو، جس کی نظر ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ﴾ ''تم پر جنگ فرض کردی گئی ہے'' پہ ہو، جان و مال اُس کے رہتے کب ہیں کہ وہ آزاد مرضی سے کوئی فیصلہ کرے!

اے ہمارے ربّ ہمیں توفیق دیجیے کہ ہم آپ کو اور آپ کے عائد کردہ کسی فریضے کو بھول نہ جائیں کیونکہ ہم اس کا تحمل نہیں کر سکتے کہ آپ ہمیں بھول جائیں! کہ آپ کو بھول کر ہم جائیں گے کہاں؟:

﴿وَ لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ O لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ (الحشر: ۱۹-۲۰)

''اور اُن لوگوں جیسے نہ ہونا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے اُنھیں ایسا کر دیا کہ وہ خود اپنے آپ کو بھول گئے، یہ بدکردار لوگ ہیں۔ جہنم والے اور جنت والے برابر نہیں، اہلِ جنت تو کامیاب ہونے والے ہیں''۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ وَ نَسْتَجِیْرُ بِکَ مِنَ النَّارِ. (آمین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۂ کتاب

عبداللہ عزام (شہیدؒ)

بے شک تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ ہم اسی کی حمد بیان کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اسی کے حضور توبہ کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی بھٹکانے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہ پر لگانے والا نہیں۔ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے اللہ! کام وہی آسان ہے جسے آپ آسان فرما دیں اور اگر آپ چاہیں تو غم سہنا بھی آسان ہو جائے۔

میں نے اصلاً جب یہ فتویٰ لکھا تھا تو یہ اپنے موجودہ حجم سے کہیں بڑا تھا۔ پھر میں نے اسے فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز کے سامنے پیش کیا اور انھیں پڑھ کر سنایا۔ آپ نے اسے پسند کیا، اس کی تائید کی اور کہا کہ: "اِنَّھَا طَیِّبَۃٌ"، "یقیناً یہ عمدہ ہے"۔ لیکن ان کی رائے یہ تھی کہ میں اسے کچھ مختصر کر دوں، وہ خود اس کا مقدمہ لکھیں اور پھر اسے چھپوا دیا جائے۔ چنانچہ میں نے اسے مختصر کیا، مگر پھر حج کے ایام آ گئے اور شیخ ابنِ باز مصروف رہے اور اللہ کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ یہ فتویٰ دوبارہ آپ کو دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔ بعد میں شیخ ابنِ باز حفظہ اللہ نے جدّہ کی مسجدِ بن لادن اور ریاض کی جامع مسجد الکبیر میں یہ فتویٰ دیا کہ آج اپنی جانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت فرضِ عین ہے۔

پھر میں نے یہ فتویٰ، آخر میں دیئے گئے چھے اضافی سوالوں کے بغیر، جوں کا توں قابلِ احترام شیوخ؛ عبداللہ علوان، سعید حویٰ، محمد نجیب المطیعی، دکتور حسین حامد حسان اور عمر سیف کے سامنے بھی پیش کیا اور انھیں پڑھ کر سنایا۔ ان سب اہلِ علم نے اس فتوے سے اتفاق کیا اور بیشتر نے اس پر دستخط بھی کر دیئے۔ اسی طرح میں نے شیخ محمد بن صالح بن عثیمین کو بھی یہ فتویٰ پڑھ کر سنایا اور آپ نے بھی

اس پر اپنے دستخط کر دیئے۔ نیز محترم شیخ عبدالرزاق عفیفی، شیخ حسن ایوب اور دکتور احمد العسّال نے بھی ایسے ہی فتاویٰ دیئے۔

پھر میں نے حج کے ایام میں منیٰ میں واقع مرکز التوعیۃ العامۃ میں خطاب کیا، جہاں پوری اسلامی دنیا سے تعلق رکھنے والے ایک سو سے زائد علماء کو اسی فتوے کا خلاصہ سناتے ہوئے میں نے کہا:

إتفق السلف والخلف وجميع الفقهاء والمحدثين في جميع العصور الإسلامية أنه: إذا اعتدى على شبر من أراضي المسلمين أصبح الجهاد فرض عين على كل مسلم ومسلمة، بحيث يخرج الولد دون إذن والده والمرأة دون إذن زوجها.

''تمام سلف وخلف اور اسلامی تاریخ کے ہر دور میں تمام فقہاء اور محدثین اس بات پر متفق رہے ہیں کہ:

اگر مسلمانوں کی سرزمین کے کسی گز بھر حصے پر بھی حملہ ہو، تو جہاد ہر مسلمان مرد و عورت پر فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بیٹا باپ کی اور عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نکلیں گے''۔

پھر میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ میں گزشتہ تین سالوں سے جہادِ افغانستان میں شریک ہوں اور اپنے تجربات اور مجاہدین کے امراء کی آراء کی روشنی میں پورے وثوق سے یہ بات کہتا ہوں کہ جہادِ افغانستان کو آج مردانِ کار کی ضرورت ہے۔ پس اے علمائے کرام! آپ میں سے کسی کو بھی اگر اس رائے پر کوئی اعتراض ہے تو بتائیے؟''

کسی ایک عالم نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا، بلکہ دکتور ادریس نے یہ کہا کہ ''میرے بھائی! اس مسئلے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں''۔ چنانچہ علماء کی اس بھرپور تائید کے بعد میں نے یہ فتویٰ چھپوایا ہے تاکہ اللہ اسے ہمارے لئے دونوں جہانوں میں نفع کا باعث بنائے اور تمام مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے۔

عبداللہ عزام (شہیدؒ)

باب اول

حملہ آور دشمن کو مسلمانوں کی سرزمین سے نکالنا

اہم ترین فرضِ عین

باب اوّل

حملہ آور دشمن کو مسلمانوں کی سرزمین سے نکالنا

اہم ترین فرضِ عین

بے شک تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ ہم اسی کی حمد بیان کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اسی کے حضور توبہ کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی بھٹکانے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی راہ پر لگانے والا نہیں۔ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ درود و سلام ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحابؓ پر۔ اما بعد:

یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے کہ اس نے ہمارے لئے اسلام کو بطور دین چنا، اسے تمام جہانوں کے لئے باعثِ رحمت بنایا، اور سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ہمراہ خاتم النبیّین بنا کر بھیجا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دلائل و براہین سے اس دین کی حقانیت واضح فرما چکے تو اللہ تعالیٰ نے تیغ و سناں سے اس دین کی نصرت فرمائی۔ امام احمدؒ اور طبرانیؒ ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

((بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ حَتّٰى يُعْبَدَ اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ جُعِلَ رِزْقِيْ تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِيْ وَ جُعِلَ الذُّلُّ وَالصَّغَارُ عَلٰى مَنْ خَالَفَ اَمْرِيْ

’’مجھے قیامت تک کے لیے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اللہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت کی جانے لگے۔ اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے تلے رکھا گیا

وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.)) (صحیح الجامع الصغیر للألبانی: ۲۸۲۸)

ہےاور جس نے بھی میرے امر کی مخالفت کی، اس کے لئے ذلت اور پستی رکھ دی گئی ہے۔ اور جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انھی میں سے ہے۔''

زمین کی اصلاح کا دارومدار ''قانونِ دفع'' پر رکھا گیا ہے

اللہ حکیم وعلیم نے زمین کی اصلاح کا دارومدار ''قانونِ دفع'' پر رکھا ہے، جس کا ذکر قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (البقرة:۲۵۱)

''اوراگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی، لیکن اللہ اہلِ عالم پر بڑا مہربان ہے''۔

یہ بنی نوع انسان پر اللہ کی خصوصی مہربانی ہے کہ اس نے ان کے لئے دفعِ فساد کا یہ قانون جاری فرمایا اور اسے ہمارے لئے اپنی پاک کتاب میں بیان بھی کر دیا ہے۔ یہ'' قانونِ دفع'' دراصل حق و باطل کی کشمکش ہی کا دوسرا نام ہے۔ تمام انسانیت کی بھلائی اسی معرکے سے وابستہ ہے۔ حق کی فرماں روائی اور قیادت اسی کے ذریعے قائم ہوتی ہے اور دنیا میں خیر پھیلانے کا ذریعہ بھی یہی ہے۔ دینی شعائر اور عبادت گاہیں بھی اسی کی بدولت محفوظ ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ

''اوراگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو (نصاریٰ کے) خلوت خانے اور گرجے اور (یہود) کے معبد اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌO﴾ (الحج: ۴۰) اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، سب منہدم ہو گئے ہوتے۔ اور جو اللہ کی مدد کرے گا، اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ قوت والا اور غلبے والا ہے''۔

کتاب اللہ کے بے شمار صفحات اس ''قانونِ دفع'' یا ''قانونِ جہاد'' کی تفصیلات پر مشتمل ہیں، تاکہ اس بارے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے کہ حق کے پاس اپنے دفاع کے لئے قوت کا ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کتنی ہی بار حق صرف اس وجہ سے پست اور مغلوب ہوا کہ حق والے اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور کتنی ہی مرتبہ باطل، باطل والوں کی حمایت اور قربانیوں کے باعث سربلند ہو گیا۔

جہاد فی سبیل اللہ کی عمارت کے دو بنیادی ستون

جہاد فی سبیل اللہ کی عمارت دو بنیادی ستونوں پر قائم ہوتی ہے:

۱۔ صبر، جو دراصل قلب و روح کی شجاعت کا مظہر ہے۔

۲۔ سخاوت، جو اللہ کی راہ میں جسم و جاں لگا دینے کا دوسرا نام ہے۔ (اور بے شک جان قربان کرنے سے بڑھ کر سخاوت اور کیا ہو سکتی ہے؟)

امام احمدؒ ایک صحیح حدیث میں روایت کرتے ہیں:

((اَلْاِيْمَانُ الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ)) ''ایمان صبر و سخاوت کا نام ہے''۔

(سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، رقم: ۵۵۴)

حافظ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

و لما كان صلاح بني آدم لا يتم في دينهم و دنياهم الا بالشجاعة والكرم، بين الله سبحانه أن من تولى عن الجهاد بنفسه أبدل الله به من يقوم بذلك: ﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (التوبة: ۳۹)

''چونکہ بنی نوع انسان کے دین ودنیا، دونوں کی بھلائی شجاعت وسخاوت کے بغیر ناممکن ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی ہے کہ جو کوئی بھی جہاد میں جان کھپانے سے ہاتھ کھینچے گا، اللہ تعالیٰ اسے ہٹا کر کسی ایسے کو اس کی جگہ لے آئیں گے جو اس فریضے کو ادا کرتا ہو، (چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے): ﴿ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا وَّ يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَلَا تَضُرُّوۡهُ شَيۡـًٔا وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴾ (التوبة : ۳۹)

''اگر تم نہ نکلے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو لے آئے گا اور تم اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے اور یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے''۔

(مجموع الفتاوی: ۲۸/ ۱۵۷)

دو بدترین صفات

جان و مال کھپانے کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخل اور بزدلی کو (جو سخاوت اور شجاعت کی ضد ہیں) بدترین صفات قرار دیا ہے، کیونکہ یہ افراد کے بگاڑ اور معاشروں کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((شَرُّمَا فِيْ رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ وَجُبْنٌ خَالِعٌ)) (أبو داود: كتاب الجهاد: في الجرأة والجبن، وهو حديث صحيح)

''دو بدترین صفات جو کسی انسان میں ہو سکتی ہیں وہ ہیں شدید بخل اور سخت بزدلی''۔

مسلمانوں کی طویل تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہمارے سلفِ صالحین جہاد کے اسی الٰہی قانون پر عمل پیرا رہے۔ نتیجتاً اللہ نے دنیا کی قیادت کا تاج انھی کے سر پر رکھا اور انسانیت کی رہنمائی بھی انھی کے نصیب میں آئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يُوۡقِنُوۡنَ ﴾ (السجدة: ۲۴)

''اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ہم نے ان کے اندر ایسے پیشوا پیدا کر دیئے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے''۔

اسی طرح ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلاحُ اَوَّلِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِالزُّهْدِ وَالْيَقِيْنِ وَ يَهْلِكُ آخرُهَا بِالْبُخْلِ والْاَملِ))

(رواه أحمد و الطبراني في الأوسط والبيهقي، صحيح الجامع الصغير، رقم: ٣٨٤٥)

''اس امت کا پہلا حصہ زہد (یعنی دنیا سے بے رغبتی) اور یقین کی وجہ سے درست تھا اور اس کا آخری حصہ بخل (کنجوسی) اور (لمبی چوڑی) تمناؤں کی وجہ سے ہلاک ہوگا''۔

اسلاف کے اس سنہری دور کے بعد مسلمانوں کی جو نسلیں آئیں وہ قوانینِ الٰہی کو چھوڑ بیٹھیں۔ ان لوگوں نے اللہ کو بھلایا تو اللہ نے بھی انھیں بھلا دیا اور انھوں نے احکاماتِ شریعت کی ناقدری کی تو وہ خود بھی بے وقعت ہو کر رہ گئے:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مريم: ٥٩)

''پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے کہ انھوں نے نماز ضائع کر دی اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے، سو وہ عنقریب نقصان اٹھائیں گے''۔

ان کی بداعمالیاں ان کے لئے خوشنما بنا دی گئیں اور خواہشات کی پیروی ہی ان کا طریقِ زندگی بن گیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

((اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ كُلَّ جَعْظَرِيٍّ جَوَّاظٍ سَخَّابٍ فِي الْاَسْوَاقِ، جِيْفَةٍ بِاللَّيْلِ، حِمَارٍ بِالنَّهَارِ، عَالِمٍ بِالدُّنْيَا، جَاهِلٍ بِالْآخِرَةِ))

(صحيح الجامع الصغير، رقم: ١٨٧٨)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نفرت کرتے ہیں ہر ایسے شخص سے جو اکھڑ مزاج متکبر ہو، (کھا کھا کر) جس کا جسم پھول چکا ہو، بازاروں میں فضول باتیں کرتے جس کا وقت گزرتا ہو، جو رات بھر مردہ لاش کی طرح (غافل پڑا رہتا) ہو، دن کو گدھے کی طرح (دنیا کے دھندوں میں لگا رہتا) ہو، دنیا کا تو خوب علم رکھتا ہو مگر آخرت کے معاملے میں بالکل جاہل ہو''۔

جہاد، ایک فریضہ گم گشتہ

امتِ مسلمہ نے جن فرائض وواجبات کو بھلا دیا، پسِ پشت ڈال دیا، ان میں سب سے اہم جہاد کا گمشدہ فریضہ ہے۔ جب مسلمانوں کی عملی زندگی سے جہاد نکل گیا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے عین مطابق سیلابی پانی کے جھاگ کی طرح بے وزن و بے حقیقت ہو کر رہ گئے:

((یُوْشِکُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعَي عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَاعَي الْاَکَلَۃُ اِلٰی قَصْعَتِھَا. فَقَالَ قَائِلٌ: وَ مِنْ قِلَّۃٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ وَلٰکِنَّکُمْ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ وَلَیَنْزِعَنَّ اللّٰہُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَھَابَۃَ مِنْکُمْ وَلَیَقْذِفَنَّ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمُ الْوَھْنَ. فَقَالَ قَائِلٌ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ مَا الْوَھْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ. وَ فِیْ رِوَایَۃٍ: قَالُوْا: وَ مَا الْوَھْنُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ: حُبُّکُمُ الدُّنْیَا وَ کَرَاھِیَتُکُمُ الْقِتَالَ)

(أبوداود: کتاب الملاحم: باب فی تداعی الأمم علی الاسلام، ورواہ أحمد بأسناد جید وھو مذکور فی سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ، رقم: ۹۵۸)

''قریب ہے کہ (کفر کی) قومیں تمہارے خلاف جنگ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دے کر بلائیں گی جس طرح بھوکے ایک دوسرے کو دستر خوان پر دعوت دے کر بلاتے ہیں''۔ اس پر ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا اس وقت ایسا ہماری قلتِ تعداد کی وجہ سے ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''(نہیں،) بلکہ اس وقت تو تم زیادہ تعداد میں ہو گے، لیکن تم سیلابی پانی کے جھاگ کی طرح ہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے ضرور ہی تمہاری ہیبت ختم کر دیں گے اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دیں گے''، تو پوچھنے والے نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کمزوری کیا ہو گی؟ فرمایا ''دنیا کی محبت اور موت کی کراہت''۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں: صحابہؓ نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! یہ کمزوری کیا ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تمہارا دنیا سے محبت کرنا اور تمہارا قتال کو ناپسند کرنا''۔

جہاد فی سبیل اللہ کی دو اقسام

کفار کے خلاف جہاد کی دو اقسام ہیں:

۱۔اقدامی جہاد (جہاد الطلب)

۲۔دفاعی جہاد (جہاد الدفع)

۱۔اقدامی جہاد (جہاد الطلب) اور اس کا شرعی حکم

اقدامی جہاد (جہاد الطلب) کا مطلب ہے:

"**طلب الكفار في بلادهم**"، یعنی خود جنگ کی ابتداء کرتے ہوئے کفار کے علاقے میں گھس کر ان پر حملہ کرنا، جب کہ وہ مسلمانوں کے خلاف قتال کے لئے تیاری بھی نہ کر رہے ہوں۔

ایسے حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہوتا ہے، جس کی ادائیگی کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ:

۱۔سرحدوں پر اہلِ ایمان کی اتنی تعداد ہر وقت موجود رہے جو سرزمینِ اسلام کے دفاع اور اللہ کے دشمنوں پر دہشت بٹھانے کے لئے کافی ہو۔

۲۔سال میں کم از کم ایک مرتبہ مسلمان فوج کو کفار کے خلاف لڑنے کے لئے ضرور بھیجا جائے۔

لہٰذا مسلمانوں کے امام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سال میں ایک یا دو مرتبہ دار الحرب کی سمت لشکر روانہ کرے اور رعایا کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں امام کے ساتھ تعاون کرے۔لیکن اگر امام کسی لشکر کو نہیں بھیجتا تو گناہ کا بوجھ اسی پر ہوگا۔(**حاشية ابن عابدين**:۳/۲۳۸)

فقہاء (سال میں ایک مرتبہ لشکر بھیجنے کے) اس مسئلے کو جزیے کے مسئلے پر قیاس کرتے ہیں۔

علمائے اصول فرماتے ہیں:

الجهاد دعوة قهرية فتجب إقامته بقدر الامكان حتى لا يبقى إلا مسلم أو مسالم.

''جہاد قوت و غلبے کے ذریعے دعوت پھیلانے کا نام ہے۔ پس جہاد کو استطاعت بھر قائم کرنا فرض ہے یہاں تک کہ کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے جو مسلمان نہ ہو یا پھر مسلمانوں سے مصالحت نہ کر چکا ہو''۔

(حاشية الشرواني وابن القاسم على تحفة المحتاج على المنهاج: ۹/۲۱۳)

دفاعی جہاد (جہاد الدّفع) اور اس کا شرعی حکم

دفاعی جہاد (جہاد الدفع) سے مراد ہے:

''دفع الكفار من بلادنا'' یعنی کفار کو مسلمانوں کے علاقوں سے باہر نکالنے کے لئے جہاد۔

دفاعی جہاد فرضِ عین، بلکہ اہم ترین فرضِ عین ہے۔ چار صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں دفاعی جہاد تعین کے ساتھ ہر ایک پر فرض ہو جاتا ہے:

۱۔ **إذا دخل الكفار بلدة من بلاد المسلمين.**

جب کفار مسلمانوں کے کسی بھی علاقے میں گھس آئیں۔

۲۔ **إذا التقى الصفان و تقابل الزحفان.**

جب کفر و اسلام کے لشکروں کا آمنا سامنا ہو اور دونوں طرف کی صفیں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔

۳۔ **إذا استنفر الإمام أفراداً أو قوماً وجب عليهم النفير.**

جب امام کچھ افراد یا کسی قوم سے جہاد کے لئے نکلنے کا مطالبہ کرے، تو ان سب پر فرض ہو جاتا ہے کہ نکلیں۔

۴۔ **إذا أسر الكفار مجموعة من المسلمين.**

جب کفار کچھ مسلمانوں کو قید کر لیں۔

جب کفار مسلمانوں کے کسی علاقے میں گھس آئیں

سلف وخلف، چاروں فقہی مذاہب کے علماء، محدّثین اور مفسّرین، تاریخِ اسلامی کے تمام ادوار میں اس بات پر غیر مشروط طور پر متفق رہے ہیں کہ اگر کفار مسلمانوں کے کسی بھی علاقے میں گھس آئیں تو وہاں بسنے والوں اور ان کے قرب و جوار میں رہنے والوں پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اولاد والدین کی، بیوی شوہر کی اور مقروض قرض خواہ کی اجازت کے بغیر نکلیں گے۔

اگر دشمن کو پچھاڑنے کے لئے یہ سب لوگ ناکافی ثابت ہوں، یا یہ لوگ کوتاہی کریں، یا سستی سے کام لیں، یا بلا عذر بیٹھے رہیں تو یہ فرضیتِ عین دائرے کی شکل میں اگلے علاقوں تک پھیلتی جائے گی، پہلے سب سے قریب والوں کو اپنی لپیٹ میں لے گی، پھر ان سے قریب والوں کو۔ پھر اگر وہ لوگ بھی ناکافی ہوں یا کوتاہی کریں (اور مزید مجاہدین کی ضرورت برقرار رہے) تو فرضیت کا یہ دائرہ بتدریج آگے پھیلتا جائے گا یہاں تک کہ (ضرورت پڑنے پر) پوری زمین کے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

”وأما قتال الدفع فهو أشد أنواع دفع الصائل عن الحرمة والدين فواجب إجماعا، فالعدو الصائل الذي يفسد الدين والدنيا لا شيء أوجب بعد الإيمان من دفعه، فلا يشترط له شرط (كالزاد و الراحلة) بل يدفع بحسب الإمكان، وقد نص على ذلک العلماء، أصحابنا وغيرهم“ اهـ.

”...اور جہاں تک بات ہے ”دفاعی قتال“ کی تو حرمتوں اور دین پر حملہ آور دشمن کو پچھاڑنے کے لئے یہ قتال کی اہم ترین قسم ہے اور اسی لئے اس کے فرض ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ ایمان لانے کے بعد سب سے اہم فریضہ دین و دنیا کو برباد کرنے والے حملہ آور دشمن کو پچھاڑنا ہے۔ اس کی فرضیت کے لئے کوئی شرائط نہیں (مثلاً زادِ راہ اور سواری موجود ہونے کی شرط بھی ساقط ہو جاتی ہے) بلکہ جس طرح بھی ممکن ہو دشمن کو پچھاڑا جائے

گا۔ یہ بات علماء نے صراحتاً کہی ہے، خواہ وہ ہمارے مذہبِ فقہی کے علماء ہوں، یا دیگر فقہی مذاہب کے''۔

(الفتاوی الکبری: ۵۲۰/۴)

امام ابنِ تیمیہؒ کے دور میں ایک قاضی نے یہ کہا کہ:

''جب کسی علاقے والوں پر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو جو لوگ اس علاقے سے قصر کی مسافت پر رہتے ہیں ان پر، حج کی طرح، جہاد بھی صرف اسی صورت میں فرض ہوگا جب ان کے پاس زادِ راہ اور سواری موجود ہو''۔

شیخ الاسلامؒ نے اس رائے کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

''قاضی نے جہاد کو حج پر قیاس کرتے ہوئے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ اس سے پہلے کسی عالم سے منقول نہیں۔ یہ نہایت کمزور رائے ہے کیونکہ جہاد اس لئے فرض کیا گیا ہے تا کہ دشمن کے شر کو دور کیا جا سکے، لہٰذا جہاد کی فرضیت ہجرت سے بھی بڑھ کر ہے۔

اب جب کہ ہجرت کے لئے سواری کی شرط نہیں تو جہاد کے لئے یہ شرط بدرجۂ اولیٰ ساقط ہو گی۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ فِيْ عُسْرِهِ وَ يُسْرِهِ وَ مُنْشَطِهِ وَ مَكْرَهِهِ وَ اَثَرَةً عَلَيْهِ))

''بندۂ مومن پر حکم سننا اور اطاعت کرنا واجب ہے، خواہ اسے تنگی ہو یا آسانی، خوشی ہو یا ناگواری اور چاہے دوسروں کو اس پر ترجیح دی جائے''۔

چنانچہ یہ حدیث اطاعتِ حکم کو لازم قرار دیتی ہے اور تنگی و آسانی، ہر حال میں جہاد کے لئے نکلنے کو فرض ٹھہراتی ہے۔ یہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں نص کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل بھی ہے کہ حج کے برخلاف، جہاد تنگی کے عالم میں بھی فرض رہتا ہے۔ تنگی یا آسانی، ہر حال میں نکلنے کا یہ حکم اقدامی قتال کے حوالے سے ہے، اور اگر معاملہ دفاعی قتال کا ہو تو وہ حرمتوں اور دین پر حملہ آور دشمن کو پچھاڑنے کی خاطر قتال کی

اہم ترین قسم ہے اور اس کے فرض ہونے پر پوری امت کا اجماع ہے۔ ایمان لانے کے بعد سب سے اہم فریضہ یہی ہے کہ دین و دنیا کو برباد کرنے والے حملہ آور دشمن کو پچھاڑا جائے، لہٰذا وہاں زادِراہ اور سواری کی شرط لگانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا''۔

(من كتاب الاختيارات العلمية لابن تيمية، ملحق بالفتاوى الكبرى:٦٠٨/٤)

مسئلہ زیرِ بحث میں مذاہبِ اربعہ کی آراء

آیئے اب اس مسئلے سے متعلق چاروں مذاہبِ فقہی کی آراء پر ایک نظر ڈالیں۔

الف۔ حنفیہ کی رائے

ابنِ عابدینؒ فرماتے ہیں:

''اگر دشمن کسی بھی اسلامی سرحد پر حملہ آور ہو جائے تو (وہاں بسنے والوں پر) جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے قرب و جوار میں بسنے والوں پر بھی جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ البتہ جو لوگ ان سے پیچھے، دشمن سے فاصلے پر بستے ہوں، تو جب تک ان کی ضرورت نہ پڑے ان پر جہاد فرضِ کفایہ ہی رہتا ہے۔ لیکن اگر کسی بھی وجہ سے ان کی ضرورت پڑ جائے، مثلاً: جس علاقے پر حملہ ہوا ہے اس کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگ دشمن کے خلاف مزاحمت کرنے میں بے بس ہو جائیں، یا بے بس تو نہ ہوں لیکن اپنی سستی کی وجہ سے جہاد نہ کریں، تو ایسی حالت میں ان کے اردگرد بسنے والوں پر بھی جہاد، نماز اور روزے کی طرح فرضِ عین ہو جاتا ہے اور اسے ترک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر فرضیت کا یہ دائرہ اس کے بعد اور پھر اس کے بعد والوں تک حسبِ ضرورت پھیلتا جاتا ہے یہاں تک کہ اسی تدریج سے بڑھتے ہوئے ایک وقت مشرق و مغرب میں بسنے والے ہر مسلمان پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔''

(حاشية ابن عابدين:٢٣٨/٣)

امام کاسانیؒ (بدائع الصنائع :۷/۷۲)، ابنِ نجیمؒ (البحر الرائق لإبن نجیم :۵/۱۹۱) اور ابنِ ہمامؒ (فتح القدير لابن همام :۵/۱۹۱) نے بھی ایسے ہی فتاویٰ دیئے ہیں۔

ب۔ مالکیہ کی رائے

''حاشية الدسوقی'' میں درج ہے کہ:

''دشمن کے اچانک حملے کی صورت میں جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے، دسوقیؒ فرماتے ہیں: دشمن کے اچانک حملے کی صورت میں دفاع کرنا ہر ایک کی ذمہ داری بن جاتی ہے، خواہ کوئی عورت، غلام یا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور چاہے شوہر، آقا یا قرض خواہ انھیں منع کریں، یہ پھر بھی نکلیں گے''۔

(حاشية الدسوقي :۲/۱۷۴)

ج۔ شافعیہ کی رائے

الرملیؒ ''نهاية المحتاج'' میں لکھتے ہیں:

''اگر کفار ہمارے علاقے میں گھس آئیں اور ہمارے اور کفار کے درمیان قصر کی مسافت رہ جائے تو اس مسافت کے اندر بسنے والے سب مسلمانوں کے لئے دفاع کرنا لازم ہوگا، حتیٰ کہ وہ لوگ جن پر عام طور پر جہاد فرض نہیں ہوتا، یعنی فقیر، کم عمر بچہ، غلام، مقروض اور عورت، اب ان پر بھی لازم ہوگا کہ وہ دفاع کریں۔''

(نهاية المحتاج :۸/۵۸)

د۔ حنابلہ کی رائے

ابنِ قدامہؒ ''المغني'' میں رقم طراز ہیں:

''تین صورتوں میں جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے:

ا۔ جب کفر و اسلام کے لشکروں کا آمنا سامنا ہو اور دونوں طرف کی صفیں ایک دوسرے سے

ٹکرا جائیں (تو وہاں موجود ہر مسلمان پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے)۔

۲۔ جب کفار کسی علاقے پر حملہ آور ہوں تو اس کے باسیوں پر فرضِ عین ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے خلاف قتال کریں اور انھیں باہر نکالیں۔

۳۔ جب امام کسی (فرد یا افراد) کو جہاد کے لئے پکارے تو ان پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نکل کھڑے ہوں''۔

(المغني: ۳۴۵/۸)

امام ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''جب دشمن اسلامی سرزمین میں گھس آئے تو بلاشبہ اسے نکال باہر کرنا قریبی آبادیوں پر، اور اگر وہ نہ نکال سکیں تو اس کے بعد والی قریبی آبادیوں پر فرض ہو جاتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کے تمام علاقوں کی حیثیت دراصل ایک ہی ملک کی سی ہے۔ ایسی حالت میں والد اور قرض خواہوں کی اجازت کے بغیر نکلنا فرض ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں امام احمدؒ کی رائے بالکل واضح ہے''۔

(الفتاوی الکبری: ۶۰۸/۴)

مذکورہ بالا صورتِ حال میں، یعنی جب دشمن مسلمانوں کے کسی علاقے پر حملہ کر دے، ہر ایک پر جہاد کے لیے نکلنا فرض ہو جاتا ہے۔ اس حکم کو شریعت کی اصطلاح میں ''نفیرِ عام'' کہا جاتا ہے۔

باب دوم

نفیرِ عام (سب کے نکلنے) کے دلائل

نفیرِ عام (سب کے نکلنے) کے دلائل

ا۔ نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل

اللہ عزّ وجل کا فرمان ہے:

﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (التوبہ:۴۱)

''نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ کے رستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے''۔

اس سے پچھلی آیتِ مبارکہ یہ بات واضح کرتی ہے کہ جو لوگ نفیر عام کے حکم کی پیروی نہیں کرتے اور جہاد کے لئے نہیں نکلتے، وہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر ان کو ہٹا کر ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آتا ہے۔ اور یہ بات اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں کہ عذاب کی وعید کسی حرام کے ارتکاب یا کسی فرض کے ترک کرنے ہی پر سنائی جاتی ہے۔

﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (التوبۃ :۳۹)

''اگر تم نہ نکلے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ کچھ اور لوگوں کو لے آئے گا اور تم اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے اور یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے''۔

ابنِ کثیرؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نفیرِ عام (یعنی تمام مسلمانوں کو نکلنے) کا حکم دیا، تاکہ اللہ کے دشمنوں، اہلِ کتاب رومی کافروں کے خلاف جنگ کی جائے۔ امام بخاریؒ نے اس آیتِ مبارکہ کو اپنی کتاب میں اس عنوان کے

تحت ذکر کیا ہے: ''سب مسلمانوں کے نکلنے کا واجب ہونا اور جہاد اور اس کی نیت سے متعلق واجب امور''۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے کانوں تک یہ بات پہنچی کہ عیسائی لشکر مدینہ پر حملے کے لئے جزیرۂ عرب کی سرحدوں پر جمع ہو رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے نفیرِ عام کا حکم دے دیا۔ اگر محض اس وجہ سے تمام مسلمانوں کو جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دے دیا گیا کہ دشمن سرحدوں پر جمع ہو رہا ہے، تو اس وقت کیا حکم ہوگا جب کفار عملاً مسلمانوں کے علاقے میں گھس آئیں؟ کیا ایسی حالت میں نفیرِ عام بدرجہ اولیٰ فرض نہیں ہوگا؟

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان ''خِفَافًا وَّ ثِقَالًا'' (نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

كُهُولًا وَّ شَبَابًا، مَا سَمِعَ اللّٰهُ عُذْرَ اَحَدٍ.

''ادھیڑ عمر ہو یا جوان (سب کو نکلنا ہوگا، کیونکہ) اللہ نے کسی کا عذر قبول نہیں کیا''۔

(مختصر ابن کثیر: ۱۴۴/۲)

امام حسن بصریؒ اسی فرمانِ الٰہی کی تشریح میں فرماتے ہیں:

فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ.

''تنگی و آسانی، دونوں حالتوں میں (نکلنا فرض ہے)''۔

امام ابنِ تیمیہؒ ''مجموع الفتاویٰ'' میں فرماتے ہیں:

فأما إذا أراد العدو الهجوم على المسلمين فإنه يصير دفعه واجبا على المقصودين كلهم و على غير المقصودين، كما قال تعالى: و ان اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ (الأنفال: ٧٢) كما أمر النبي صلى الله عليه و سلم بنصر المسلم و سوآء كان الرجل من المرتزقة للقتال أو لم يكن وهذا يجب بحسب الامكان على كل أحد بنفسه و ماله مع القلة و الكثرة والمشي و الركوب، كما كان المسلمون لما قصدهم العدو عام الخندق لم يأذن الله في تركه لأحد.

''پس اگر دشمن مسلمانوں پر حملے کا ارادہ کرے تو اسے دفع کرنا سب پر فرض ہوگا؛ اُن پر بھی جو حملے کا ہدف ہوں اور اُن پر بھی جو ہدف نہ ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ﴾ (الأنفال: ۷۲)

''اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے''۔

اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی (کئی احادیثِ مبارکہ میں) مسلمانوں کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ حکم سب کے لئے ہے، خواہ کوئی باقاعدہ تنخواہ دار فوجی ہو یا عام مسلمان، ہر ایک پر حسبِ استطاعت جان و مال سے دفاعی جہاد کرنا فرض ہے، چاہے قلت ہو یا کثرت، سواری میسر ہو یا پیدل ہی نکلنا پڑے۔ بالکل اسی طرح جیسے غزوۂ خندق کے موقع پر جب دشمن نے مسلمانوں کا رخ کیا تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی جہاد سے پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی''۔

(مجموع الفتاوی: ۳۵۸/۲۸)

امام زُھریؒ فرماتے ہیں:

خرج سعيد بن المسيب إلى الغزو و قد ذهبت إحدى عينيه فقيل له: إنک عليل، فقال: استنفر الله الخفيف و الثقيل، فإن لم يمكن لي الحرب كثرت السواد و حفظت المتاع.

''حضرت سعید بن المسیّب رحمہ اللہ علیہ جنگ کے لئے نکلے، حالانکہ ان کی ایک آنکھ پہلے ہی جنگ کی نذر ہو چکی تھی۔

آپ سے کہا گیا: آپ معذور ہیں، آپ آرام کیجئے، نکلنے کو اور بہت سے لوگ موجود ہیں۔ فرمایا: نہیں، اللہ نے خفیف و ثقیل، ہر شخص کو نکلنے کو کہا ہے۔ اگر میں جنگ نہیں کرسکتا تو کیا ہوا، مجاہدین کی تعداد میں اضافے کا سبب ہی بن جاؤں گا اور ان کے سامان کی حفاظت کروں گا''۔

(الجامع لأحكام القرآن: ۱۵۰/۸)

۲۔ تم سب ان سب سے لڑو

اللہ عز وجل کا فرمان ہے:

﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (التوبة:٣٦)

''اور ان مشرکین سے سب مل کر لڑو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کا ساتھی ہے''۔

ابن العربیؒ فرماتے ہیں:

''(اس آیت میں وارد ہونے والے لفظ) ''کَآفَّةً'' سے مراد ہے: ہر جانب سے اور ہر حالت میں انھیں گھیرتے ہوئے (ان سے جنگ کرو)''۔

(الجامع لأحكام القرآن:۸/۱۵۰)

۳۔ فتنے کے خاتمے تک جہاد فرض ہے

اللہ عزّ وجل کا فرمان ہے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ ﴾(الأنفال:٣٩)

''اور ان سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کا ہو جائے''۔

یہاں فتنے سے مراد شرک ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور السدیؒ وغیرہ نے واضح طور پر لکھا ہے۔(تفسير القرطبي:٢/٢٥٣)

بلاشبہ جب کفار حملہ آور ہوں اور ہمارے علاقے پر قبضہ کر لیں تو امت کا دین داؤ پر لگ جاتا ہے اور عقیدہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ پس ایسی حالت میں دین، نفس، عزت اور مال کو بچانے کے لئے قتال فرض ہو جاتا ہے۔

۴۔ جب بھی جہاد کے لئے نکلنے کا تقاضا ہو

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَ لٰكِنْ جِهَادٌ وَّ نِيَّةٌ وَ اِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا))

(بخاري: كتاب الجهاد و السير: وجوب النفير وما يجب من الجهاد والنيّة)

''فتح (مکہ) کے بعد (مکہ سے مدینہ) ہجرت باقی نہیں رہی، لیکن جہاد اوراس کی نیت اب بھی باقی ہے، اور جب تم سے نفیر (یعنی جہاد کے لئے نکلنے) کا تقاضا کیا جائے تو نکل پڑو''۔

لہٰذا امت سے جب بھی نفیرِ عام (یعنی سب کے نکلنے) کا مطالبہ ہو تو سب مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد کے لئے نکلیں، اور بلاشبہ کفار کے حملے کی صورت میں شریعت مسلمانوں سے یہی مطالبہ کرتی ہے۔ نفیرِ عام (سب کا نکلنا) دوصورتوں میں فرض ہو جاتا ہے: ۱۔ جب امام جہاد کے لئے پکارے یا ۲۔ جب مسلمانوں کو مدد کی ضرورت پڑ جائے (خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے)۔

جیسا کہ ابنِ حجرؒ اس حدیث کی تشریح میں امام قرطبیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

كل من علم بضعف المسلمين عن عدوهم وعلم أنه يدركهم ويمكنه غياثهم لزمه أيضا الخروج إليهم.

''ہر وہ شخص جس کے علم میں یہ بات آ جائے کہ مسلمان اپنے دشمن کے مقابلے میں کمزور ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ اُس کے لئے ان تک پہنچنا اور ان کی مدد کرنا ممکن ہے، تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ ان کا ساتھ دینے کے لئے (چاہے کوئی اسے پکارے یا نہ پکارے) نکل پڑے''۔

(فتح الباري: ۳۰/۶)

(اسی مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ''مؤطا امام مالکؒ'' کی شرح میں لکھتے ہیں: ''یہ ضروری نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ آؤ جہاد کرو۔ مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو نفیر کا تقاضا کر رہی ہو۔ پس جب کافروں نے اسلامی ملکوں (پر حملے) کا قصد کیا اور مسلمانوں

اور کافروں میں لڑائی شروع ہوگئی تو جہاد فرض ہوگیا۔ اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوئی اور مسلمانوں کی شکست کا خوف ہوا، تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانانِ عالم پر جہاد فرض ہو گیا، خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے۔ یہی حال تمام فرائض کا ہے۔ نماز کا جب وقت آ جائے تو خواہ مؤذن کی صدائے حی علی الصلوٰۃ سنائی دے یا نہ دے، وقت کا آنا وجوب کے لیے کافی ہوتا ہے''۔ (مترجم))

۵۔ ضروریاتِ خمسہ کی حفاظت فرض ہے

اللہ کی طرف سے نازل ہونے والا ہر دین ''پانچ بنیادی ضروریات'' کی حفاظت کے لئے آیا ہے، جنہیں شریعت کی اصطلاح میں ''ضروریاتِ خمسہ'' کہا جاتا ہے، یعنی:

۱۔ دین

۲۔ جان

۳۔ عزت

۴۔ عقل

۵۔ مال

چنانچہ ان ضروریاتِ خمسہ کی ہر ممکن طریقے سے حفاظت کرنا فرض ہے۔ اسلام نے ''عدوّ صائل'' (حملہ آور دشمن) کے مقابلے کا حکم بھی اسی لئے دیا ہے تاکہ ان ضروریات کی حفاظت کی جا سکے۔ (جامع الأحکام: ۱۵۰/۸)

(ضروریاتِ خمسہ کی یہ ترتیب ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے۔ اس ترتیب کے مطابق دین کی حفاظت جان، عزت، عقل اور مال، سب کی حفاظت پر مقدم ہے۔ اسی لیے اگر کفار حملہ آور ہوں اور دین داؤ پر لگ جائے تو شریعت یہی حکم دیتی ہے کہ دفاعِ دین کی خاطر اپنا سب کچھ، حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کر دی جائے، اور یہ تجزیہ کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے کہ قتال کرنے سے فائدہ زیادہ ہوگا یا نقصان، کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دین کے نقصان سے بڑا اور کوئی نقصان نہیں۔ اسی ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے تو مصنف کی یہ بات سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ عدوِ صائل کے خلاف دفاعی جہاد محض فرضِ عین ہی نہیں، اہم ترین فرضِ عین ہے۔ (مترجم))

''عدوّ صائل'' سے مراد وہ دشمن ہے جو کسی دوسرے کی جان، مال یا عزت کے درپے ہو اور اسے بزور مغلوب کرنے کے لئے اس پر حملہ کرے۔

الف۔ عزت پر حملہ آور دشمن کے خلاف دفاع

فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ عزت پر حملہ آور دشمن کو پچھاڑنا فرض ہے، چاہے وہ حملہ آور خود بھی مسلمان ہو۔ عزت کا دفاع بہر حال کیا جائے گا، خواہ ایسا کرنے میں حملہ آور قتل ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اسی لئے فقہاء نے یہ بات صراحت سے لکھی ہے کہ اگر کسی مسلمان عورت کو اپنی عزت پامال ہونے کا خوف ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے دشمن کے حوالے کر دے، (یعنی اس پر مزاحمت فرض ہے) چاہے اسے (نتیجتاً) قتل ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔

ب۔ مال و جان پر حملہ آور دشمن کے خلاف دفاع

جمہور علماء اور مالکی و شافعی مذہب کی راجح رائے کے مطابق مال و جان پر حملہ آور دشمن کو پچھاڑنا فرض ہے، چاہے وہ حملہ آور مسلمان ہو اور چاہے مقابلے کے دوران وہ مارا ہی کیوں نہ جائے۔ صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان منقول ہے:

((مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَهْلِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ))

(حديث صحيح، رواه أحمد و أبو داود و الترمذي والنسائي. حاشية ابن عابدين :٣٨٣/٥، و الزيعلي : ١١٠/٦، ومواهب الجليل: ٣٢٣/٦ ، وتحفة المحتاج: ١٢٤/٤، والاقناع: ٢٩٠/٤، و الروضة البهية: ٣٧١/٢، والبحرالزخار: ٢٦٨/٦، و تاج العروس، صحيح الجامع الصغير للالباني: ٦٣٢١)

”جو کوئی اپنے مال کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے، اور جو کوئی اپنی جان کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے اور جو کوئی اپنے دین کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے اور جو کوئی اپنے خاندان کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے“۔

امام ابوبکر جصاصؒ یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

لا نعلم خلافا أن رجلا لو شهر سيفا على رجل ليقتله بغير حق أن على المسلمين قتله.

''اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو ناحق قتل کرنے کے لئے اس پر تلوار اٹھائے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اسے قتل کر ڈالیں۔ ہمارے علم میں نہیں کہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف پایا جاتا ہو''۔

(أحكام القرآن للجصاص: ۱/۲۴۰۲)

ایسی صورتِ حال میں اگر حملہ آور (صائل) مارا جائے تو چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، وہ جہنم میں جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس، اگر اپنا دفاع کرنے والا (عادل) مارا جائے تو وہ شہادت کا رتبہ پائے گا۔ اگر مسلمان حملہ آور کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے تو ان کافروں کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہوگا جو مسلمانوں کی سرزمین پر حملہ آور ہوں اور مسلمانوں کا دین، عزت، جان اور مال سب ہی خطرے میں پڑ جائیں؟ کیا ایسی حالت میں بھی مسلمانوں پر کافر عدوِ صائل اور حملہ آور کافر ملک کو پچھاڑنا فرض نہیں ہوگا؟

۶۔ کفار مسلمان قیدیوں کو ڈھال بنالیں تب بھی لڑا جائے گا

اگر کفار مسلمان قیدیوں کو اپنی فوج کے سامنے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کے علاقے پر قبضے کے لئے پیش قدمی کریں تو بھی ان سے جنگ کرنا فرض ہے، خواہ نتیجتاً مسلمان قیدی مارے ہی کیوں نہ جائیں۔ (اس مسئلے کو شریعت کی اصطلاح میں ''مسئلۂ تترُّس'' کہا جاتا ہے۔) امام ابنِ تیمیہؒ ''مجموع الفتاویٰ'' میں فرماتے ہیں:

''حتیٰ کہ اگر کفار کے درمیان دنیا کے بہترین، نیک و صالح لوگ موجود ہوں، مگر ان کے قتل ہوئے بغیر کفار سے قتال کرنا ناممکن ہو تو انھیں بھی (کفار کے ساتھ ہی) قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ چاروں امام اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کفار مسلمان قیدیوں کو بطور ڈھال استعمال کریں اور کفار پر حملہ نہ کرنے کی صورت میں باقی مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، تو ان مسلمان قیدیوں پر اسلحہ برسانا جائز ہوگا، اگرچہ نیت کفار ہی کو مارنے کی کی جائے گی۔ بعض علماء کے نزدیک اگر باقی مسلمانوں کو کفار سے خطرہ نہ بھی ہو، تب بھی (کفار کو مارنے

کی نیت سے) ان (ڈھال بنائے گئے) مسلمانوں پر اسلحہ برسانا جائز ہے''۔

(مجموع الفتاوی:۲۸/۵۳۷)

اسی کتاب کے صفحہ ۴۵ پر آپؒ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اور اجماعِ امت، دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اگر مسلم حملہ آور (صائل) کو قتل کئے بغیر، اُس کے شر سے نجات پانے کی کوئی صورت نہ ہو تو اسے قتل کر دیا جائے، چاہے جو مال وہ چھیننا چاہ رہا ہو وہ محض دینار (سونے) کا ایک قیراط ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ ''جو شخص اپنے مال کا دفاع کرتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے''۔

شریعت نے ڈھال بنائے گئے مسلمان قیدیوں کو قتل کرنے کی اجازت اسی لئے دی ہے کیونکہ باقی مسلمانوں کو فتنے اور شرک سے بچانا اور ان کے دین، عزت اور مال کی حفاظت کرنا ان چند لوگوں کی زندگیاں بچانے سے زیادہ اہم ہے۔

۷۔ کیا باغی کافر ممالک کے خلاف قتال، مسلم باغیوں کے خلاف جنگ سے اولیٰ نہیں؟

اللہ عزّ وجل کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾

(الحجرات: ۹)

''اور اگر مسلمانوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔ اور انصاف کرو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں''۔

پس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی وحدت اوران کے دین، عزت اور مال کے تحفظ کے لئے مسلمان باغی گروہ کے خلاف قتال فرض قرار دیا ہے۔ جب مسلمان باغیوں کے حوالے سے اللہ ربّ العزت کا حکم یہ ہے، تو خود ہی سوچیے کہ باغی کافر ملک کے بارے میں حکم کیا ہوگا؟ یقیناً ان کے خلاف قتال تو اس سے کہیں بڑھ کر فرض ہوگا۔

۸۔ کیا غاصب ممالک کے خلاف قتال، محاربین کے خلاف قتال سے کہیں بڑھ کر فرض نہیں؟

اللہ عزّ وجل کا فرمان ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَ اَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (المآئدة: ۳۳)

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں، ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ تو ہوئی ان کی دنیوی ذلت وخواری اور آخرت میں ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے“۔

اس آیتِ مبارکہ میں ان مسلمان محاربین کی سزا بیان کی گئی ہے جو مسلمان عوام کو خوفزدہ کریں، زمین میں فساد پھیلائیں، لوگوں کے مال چھینیں اور عزتیں پامال کریں۔

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ، دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ عرینہ کے بدّوؤں پر یہ سزا عملاً نافذ کی۔ (أنظر: الفتح الرباني ترتی مسند الامام أحمد الشيباني لأحمد عبدالرحمٰن البنا: ۱۸/۱۲۸)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ عکل اور عرینہ کے کچھ

لوگوں پر حد جاری فرمائی، جنہوں نے مسلمان چرواہے کو قتل کیا تھا اور اونٹ ہنکا کر لے گئے تھے:

((... فَقَطَعَ اَیْدِیَهُمْ وَ اَرْجُلَهُمْ وَ سَمَرَ اَعْیُنَهُمْ فَاُلْقُوْا بِالْحَرَّةِ یَسْتَسْقُوْنَ فَلاَ یُسْقَوْنَ، قَالَ اَبُوْ قِلَابَةَ: هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ سَرَقُوْا وَ قَتَلُوْا وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ وَ حَارَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ))

(صحیح بخاري: کتاب المحاربین من أهل الکفر والردّة: سمر النبي صلی الله علیه و سلم أعین المحاربین)

''...پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے اور سلائی پھروا کر ان کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ پھر انھیں میدان میں پھینک دیا گیا، وہ پانی مانگتے تھے مگر انھیں پانی نہیں دیا جاتا تھا (یہاں تک کہ وہ مر گئے)۔ ابو قلابہ نے (اس سزا کی وجہ بتاتے ہوئے)فرمایا: یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے چوری کی تھی، قتل کا ارتکاب کیا تھا، ایمان لانے کے بعد کفر کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑے تھے''۔

اب خود ہی بتائیے کہ اگر ان مسلمان محاربین کو یہ سزا دی گئی تو ان کافر ممالک کی سزا کیا ہوگی جو مسلمانوں کا دین، مال اور عزت، سب پامال کر رہے ہوں؟ یقیناً وہ اس سے کہیں زیادہ مستحق ہیں کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے اور بلاشبہ مسلمانوں پر بھی کہیں بڑا فرض ہے کہ وہ ایسے ممالک کے خلاف جہاد کریں۔

یہ تھے وہ چند دلائل جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کی سرزمین پر حملہ آور ہوں تو نفیرِ عام (یعنی تمام لوگوں کا جہاد کے لئے نکلنا) فرض ہو جاتا ہے۔ حملہ آور کفار کے بالمقابل دفاعی جہاد کرنا محض فرض ہی نہیں، ایمان لانے کے بعد اہم ترین فریضہ ہے۔ جیسا کہ امام ابنِ تیمیہؒ نے فرمایا ہے:

فالعدو الصائل الذي یفسد الدین و الدنیا لا شيء أوجب بعد الایمان من دفعه.

''ایمان لانے کے بعد سب سے اہم فریضہ دین و دنیا کو برباد کرنے والے حملہ آور دشمن (عدوِ صائل) کو دفع کرنا ہے''۔

(الفتاوی الکبری:۴/۶۰۸)

باب سوم

موجودہ حالات میں فلسطین اور افغانستان میں جاری قتال کا شرعی حکم

باب سوم

موجودہ حالات میں فلسطین اور افغانستان میں جاری قتال کا شرعی حکم

اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کفار اگر مسلمانوں کی گز بھر زمین پر بھی چڑھائی کر دیں تو اس علاقے میں بسنے والوں اور ان کے قریب رہنے والوں پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ پھر اگر یہ لوگ دشمن کو باہر نکالنے کے لئے کافی نہ ہوں یا کوتاہی کریں یا سستی دکھائیں، تو جہاد کی فرضیتِ عین کا دائرہ ان کے پڑوس میں بسنے والوں تک بھی پھیل جاتا ہے۔ پھر فرضیت کا یہ دائرہ بتدریج پھیلتا جاتا ہے، یہاں تک کہ (ضرورت پڑنے پر) شرقاً غرباً پوری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور ایسی صورت میں (یعنی جب جہاد فرضِ عین ہو جائے) بیوی شوہر کی، اولاد والدین کی اور مقروض قرض خواہ کی اجازت کا پابند نہیں رہتا۔ (یاد رہے کہ عورت کے لئے جہاد میں جانا تبھی جائز ہوگا جب اس کے ساتھ کوئی محرم موجود ہو (مترجم)) چنانچہ:

۱۔ کوئی بھی ایسا قطعۂ زمین جو کبھی اسلامی رہا ہو، جب تک کفار کے قبضے میں ہے (اسے دشمن سے واپس لینے تک) سب مسلمانوں کی گردنوں پر اس کا گناہ باقی رہے گا۔

۲۔ جو شخص جتنی زیادہ استطاعت، امکانیات اور طاقت کا حامل ہوگا، اس کے کندھوں پر اس گناہ کا بوجھ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ لہٰذا معاشرے میں نمایاں حیثیت کے حامل علماء، قائدین اور داعیوں پر گناہ کا یہ بوجھ عام لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی جن سرزمینوں میں آج جہاد جاری ہے، مثلاً افغانستان، فلسطین، فلپائن، کشمیر، لبنان، چاڈ، اریٹریا (اور اب عراق، شیشان وغیرہ بھی)، امتِ مسلمہ کی موجودہ نسل ان علاقوں کے دفاع کے لئے نہ نکلنے پر زیادہ گنہگار ہوگی، بہ نسبت ان علاقوں کے جو سابقہ ادوار میں مسلمانوں سے چھینے گئے۔ (مثلاً: سائبیریا، بلقان کے ممالک، سپین، یونان، ہنگری، آسٹریا،

پرتگال، قبرص، نصف فرانس، جنوبی یورپ کے دیگر علاقے، روس کے زیر قبضہ مسلمانوں کی اراضی، ہندوستان، تھائی لینڈ اور فلپائن کے مقبوضہ مسلم جزائر، اراکان، مشرقی ترکستان یعنی کاشغر، سنکیانگ وغیرہ)

ہماری رائے میں اس وقت ہماری تمام تر کوششوں کا مرکز جہادِ افغانستان اور جہادِ فلسطین کو ہونا چاہئے، کیونکہ آج کے مرکزی معرکے یہی ہیں، یہاں قابض مکّار دشمن توسیع پسندانہ عزائم کے حامل ہیں، ان دونوں محاذوں پر فتح بہت سے دیگر محاذوں پر فتح کی کنجی ہے اور ان دونوں کا دفاع درحقیقت ساری امت کا دفاع ہے۔ (واضح رہے کہ جس وقت یہ فتویٰ دیا گیا تھا اس وقت تک امریکا، برطانیہ اور دیگر صلیبی ممالک نے جزیرۂ عرب اور عراق وغیرہ پر چڑھائی نہیں کی تھی، نہ ہی دیگر تحریکاتِ جہاد نے یوں زور پکڑا تھا۔ (مترجم))

افغانستان ہی سے آغاز کیوں؟

دیارِ عرب میں بسنے والے مسلمانوں میں سے جس کے لئے بھی فلسطین جا کر جہاد کرنا ممکن ہے، اسے پہلے فلسطین ہی جانا چاہیے اور جو وہاں نہ جاسکتا ہو اسے افغانستان کا رخ کرنا چاہیے۔

جہاں تک باقی مسلمانوں کا تعلق ہے تو میری رائے میں انھیں افغانستان ہی سے جہاد کا آغاز کرنا چاہیے۔ میں انھیں فلسطین سے پہلے افغانستان آنے کی دعوت اس لئے نہیں دے رہا کہ افغانستان فلسطین سے زیادہ اہم ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کا اولین قضیہ معرکۂ فلسطین ہی ہے۔ فلسطین انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سرزمین ہے، عالمِ اسلام کا دل ہے، لیکن بعض وجوہات کی بنیاد پر ان حالات میں افغانستان ہی سے جہاد کا آغاز کرنا بہتر ہوگا:

۱۔ افغانستان میں اس وقت میدان گرم ہو چکا ہے

افغانستان میں اس وقت جہاد جاری ہے، میدان گرم ہو چکا ہے، اور دامنِ ہندوکش میں جاری یہ معرکہ اتنی شدت اختیار کر چکا ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں کی اسلامی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

۲۔اس جہاد کا ہدف اللہ کے کلمے کی سر بلندی کے سوا کچھ نہیں

جہادِ افغانستان میں خالص اسلامی پرچم بلند کیا گیا ہے جس پر جلی حروف میں ''لا الــٰـہ الا اللّٰـہ محمد رسول اللّٰہ'' لکھا ہوا ہے۔اس جہاد کا ہدف اللہ کے کلمے کی سر بلندی کے سوا کچھ نہیں۔''مجاہدینِ افغانستان کے اسلامی اتحاد'' نے اپنے دستور کی دوسری شق میں لکھا ہے:

''اس اتحاد کا ہدف افغانستان میں حکومتِ اسلامیہ کا قیام ہے''۔

اسی دستور کی تیسری شق یہ ہے:

''ہمارا یہ ہدف اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے:

﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾

''فرماں روائی کا حق کسی کو حاصل نہیں سوائے اللہ کے''۔

چنانچہ حاکمیتِ مطلق اللہ ربّ العالمین ہی کے لئے مخصوص ہے''۔

۳۔افغانستان میں معرکے کی قیادت بنیادی طور پر اسلامیوں نے سنبھال رکھی ہے

افغانستان میں معرکے کی قیادت بنیادی طور پر اسلامیوں نے سنبھال رکھی ہے اور جو لوگ آج جہاد کو لے کر چل رہے ہیں وہ افغانستان کی اسلامی تحریکات ہی کے فرزند ہیں، علماء وحفّاظِ قرآن ہیں۔

دوسری طرف فلسطین میں معاملہ اس سے مختلف ہے۔وہاں ہر قسم کے لوگ قیادت کے منصب پر فائز ہیں۔جہاں ان میں سچے مخلص مومنین ہیں، وہیں عام سے مسلمان اور اشتراکی بھی شامل ہیں،اور یہ سب ایک سیکولر حکومت کے پرچم تلے جمع ہیں۔

۴۔ جہادِ افغانستان طاغوتوں کے تابع نہیں

جہادِ افغانستان ابھی تک مجاہدین کے اپنے ہاتھوں میں ہے اور وہ ہمیشہ مشرک ممالک کی جانب سے امداد کی پیشکشوں کو مسترد کرتے رہے ہیں۔

(جہادِ افغانستان کو روس و امریکا کی جنگ کہنے والے دراصل مغربی ذرائع ابلاغ کی زبان بولتے ہیں۔ یہ لوگ مجاہدین کو امریکا کے آلہء کار کہہ کر اولیاء اللہ کو مطعون کرتے ہیں۔ حقیقت میں مجاہدین نے مشرک ممالک سے کبھی امداد وصول نہیں کی۔ تاہم ان کافر اقوام نے جہادِ افغانستان کے شروع ہونے کے ۵،۶ سال بعد جب اس کی کامیابی کو یقینی جانا تو بعض مسلم ممالک کے ہاتھ اپنا اسلحہ فروخت کیا جو بعض افغان تنظیموں کو ملتا رہا۔ (مترجم))

اس کے برعکس، فلسطین کی تحریک (پی ایل او) نے تمام تر انحصار سوویت اتحاد پر کیا، مگر اس نے مشکل ترین حالات میں فلسطین کا ساتھ چھوڑ دیا تاکہ وہ تنہا ہی عالمی سازش کا مقابلہ کرے۔ نتیجتاً، فلسطین دنیا کے بڑے ممالک کے ہاتھوں میں محض ایک کھلونا بن کر رہ گیا۔ اس کی زمین، اس کے لوگ اور اس کی عزت... سب کچھ داؤ پر لگ گیا۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ عرب ریاستوں میں گھس کر بھی اُن کا تعاقب کیا گیا یہاں تک کہ ان کی عسکری قوت اور ان کا کوئی منظم وجود باقی نہ بچا۔

۵۔ اگر مختلف طرح کے دشمنوں سے سابقہ ہو تو امام کو خطرناک ترین دشمن سے قتال کا آغاز کرنا چاہیئے

افغانستان کی سرحدیں مجاہدین کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ تقریباً تین ہزار کلومیٹر طویل سرحد ایسی ہے کہ اس سے بلا روک ٹوک گزرا جا سکتا ہے۔ سرحد کے اردگرد کے علاقوں میں بھی قبائل آباد ہیں جو کسی سیاسی انتظامیہ کے تحت نہیں آتے اور مجاہدین کے لئے ایک مضبوط حفاظتی فصیل کا کام دیتے ہیں۔

فلسطین میں صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں تو سرحدیں ہر سمت سے بند ہیں،

ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور انتظامیہ کڑی نگاہیں رکھے ہوئے ہے کہ کہیں کوئی مسلمان یہودیوں سے قتال کے لئے اندر نہ گھس آئے۔

امام شافعیؒ ''كتاب الأم'' میں لکھتے ہیں:

فان اختلف حال العدو فكان بعضهم أنكى من بعض أو أخوف من بعض فليبدأ الامام بالعدو الأخوف أو الأ نكى ولا بأس أن يفعل وان كانت داره أبعد ان شاء الله تعالى حتى ما يخاف لمن بدأ به لما لا يخاف من غيره مثلا. وتكون هذه بمنزلة الضرورة، لأنه يجوز في الضرورة ما لا يجوز في غيرها.

وقد بلغ النبي صلى الله عليه وسلم عن الحارث بن أبي ضرار أنه مجمع له فأغاره النبي صلى الله عليه وسلم و قربه عدو أقرب منه.

وبلغه أن خالد بن أبي سفيان بن شح يجمع له فأرسل ابن أنيس فقتله و قربه عدو أقرب.

''اگر مختلف طرح کے دشمنوں سے سابقہ ہو، جن میں سے بعض بعضوں سے زیادہ موذی یا خطرناک ہوں، تو امام کو چاہیئے کہ موذی ترین یا خطرناک ترین دشمن سے قتال کا آغاز کرے۔

اگر ایسا خطرناک دشمن باقی دشمنوں کی نسبت زیادہ دور رہتا ہو، تب بھی اس کے خلاف قتال کا آغاز کرنے میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں، یہاں تک کہ دور کے دشمن، جس کے خلاف جنگ کا آغاز کیا گیا تھا، اس کا خطرہ ختم ہو جائے...

یہ اقدام (یعنی قریب کے دشمن کو چھوڑ کر دور کے دشمن سے لڑنا) ''ضرورت'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی اٹھایا جائے گا، کیونکہ ''حالتِ ضرورت'' ہی میں ایسے کام جائز ہو سکتے ہیں جو عام حالات میں جائز نہیں ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی ایسا ہو چکا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

خبر ملی کہ حارث بن ابی ضرار مسلمانوں پر حملے کے لئے لشکر جمع کر رہا ہے تو آپؐ نے اس پر حملہ کر دیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دوسرے دشمن بھی موجود تھے، جو اس کی نسبت نزدیک تر تھے۔

اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ خالد بن ابی سفیان بن شیح مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہا ہے تو آپؐ نے حضرت ابن انیس رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا اور انھوںؓ نے جا کر اسے قتل کر دیا۔ (چنانچہ اس موقع پر بھی آپؐ نے دور کے دشمن پر حملے کا حکم دیا) حالانکہ اس سے قریب تر دیگر دشمن بھی موجود تھے''۔

(کتاب الام ۴/۱۷۷)

(آخر الذکر واقعے کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

ماہِ محرم ۴ ہجری کی ۵ تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ خالد بن سفیان بن شیح مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے فوج جمع کر رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کارروائی کے لیے حضرت عبداللہ بن انیسؓ کو روانہ فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن انیسؓ مدینہ سے اٹھارہ روز باہر رہ کر تئیس (۲۳) محرم کو واپس تشریف لائے۔ وہ خالد کو قتل کر کے اس کا سر بھی ہمراہ لائے تھے۔ جب خدمتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر انھوں نے یہ سر آپؐ کے سامنے پیش کیا تو آپؐ نے انھیں ایک عصا مرحمت فرمایا۔ اور فرمایا کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان قیامت کے دن نشانی رہے گا۔

جب ان کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے وصیت کی کہ یہ عصا بھی ان کے ساتھ ان کے کفن میں لپیٹ دیا جائے''۔ (زاد المعاد: ۲/۱۰۸) (مترجم))

۶۔ یہ پہاڑ اور اس میں بسنے والے لوگ...

افغانستان کے باسی اپنی شجاعت، جفاکشی اور عالی ہمتی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا اللہ رب العزت نے یہ پہاڑ اور ان میں بسنے والے لوگ خاص طور پر جہاد ہی کے لئے تیار فرمائے ہیں۔

(جن مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر امام عبداللہ عزامؒ نے افغانستان سے جہاد کے آغاز کو ترجیح دی تھی، یہ ائمہ عمل بہت دوررس فکر اور عالمِ اسلام کے مختلف خطوں میں ہونے والے پے در پے جہادی تجربات وتحریکات کا نچوڑ تھا۔ وقت نے ثابت کیا کہ یہ جہاد اسلام کے دفاع اور غلبے کی مہم کی اساس بن گیا۔ سرزمینِ خراسان میں اسی جہاد کے تسلسل کے نتیجے میں اسلامی امارت قائم ہوئی، شریعت کا غلبہ ہوا۔ مغربی تہذیب کے فساد سے پاک تعلیمی ومعاشرتی زندگی کی ایک جھلک اہلِ اسلام کو دیکھنے کو ملی، اسلام کے نظامِ عدل کا قیام ممکن ہوا۔

حقیقت میں افغانستان میں عالمی صلیبی کفر کے خلاف جاری موجودہ جہاد، آج بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کے یہ تمام اسباب اپنے اندر موجود رکھتا ہے۔ وما التوفيق إلا بالله. (مترجم))

باب چہارم

فرضِ عین اورفرضِ کفایہ

باب چہارم

فرضِ عین اور فرضِ کفایہ

فرضِ عین سے مراد ہے وہ فرض جسے خود (بنفسِ نفیس) ادا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہو، مثلاً نماز اور روزہ۔ فرضِ کفایہ کا مطلب ہے وہ فرض جو اگر بعض لوگ ادا کر دیں تو باقیوں پر اس کی ادائیگی لازم نہیں رہتی۔ اسے فرضِ ''کفایہ'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی ادائیگی کے لئے لوگ ''کافی'' نہ ہوں تو تمام لوگ ہی گنہگار ہوتے ہیں، اور اگر اس کی ادائیگی کے لئے درکار تعداد پوری ہو جائے (یعنی ''کفایت'' ہو جائے) اور فرض ادا کر دیا جائے، تو باقی سب لوگوں پر سے فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔

ابتداء میں فرضِ کفایہ بھی فرضِ عین کی طرح سب پر فرض ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ فرضِ کفایہ کو اگر بعض لوگ ادا کر دیں تو باقیوں پر سے فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، جب کہ فرضِ عین ہر ایک کو خود ہی ادا کرنا ہوتا ہے، کسی دوسرے کے ادا کرنے سے باقیوں کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ (المغني لابن قدامة: ۸/۳۴۵)

اسی لئے امام فخر الدین رازیؒ نے فرضِ کفایہ کی یہ تعریف بیان کی ہے:

یقصد حصوله من غیر النظر بالذات إلی فاعله.

''وہ فرض جس کا پورا کیا جانا ہی اصل مقصود ہو، چاہے اسے کوئی بھی ادا کر دے''۔

(أنظر: المحصول للرازيؒ، تحقیق الدکتور طٰه جابر ج أ، قسم (۲) ص: ۳۱)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

إن الواجب الکفائي مطلوب علی العموم و مراد به الخصوص.

''فرضِ کفایہ ایک ایسا فرض ہے جس کا حکم سب کو دیا جاتا ہے، مگر اس کی ادائیگی چند لوگوں ہی سے کرانا مقصود ہوتی ہے''۔

(أصول الفقه لأبي زهرة)

جمہور اصولیین، جن میں ابن الحاجبؒ، آمدیؒ اور ابنِ عبد الشکورؒ بھی شامل ہیں، فرماتے ہیں کہ

فرضِ کفایہ (ابتداء میں) سب پر فرض ہوتا ہے، مگر بعض لوگوں کی جانب سے ادائیگی باقیوں پر سے اس کی فرضیت ساقط کر دیتی ہے۔

محض ہلکی پھلکی مزاحمت سے فرضیت کی ادائیگی نہیں ہو جاتی

بعض لوگ جہاد کے شرعی حکم کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاد آج فرضِ عین نہیں، فرضِ کفایہ ہے۔ اگر ہم ایک لمحے کے لئے ان کی یہ بات تسلیم کر لیں تب بھی ان کی گلو خلاصی نہیں ہوتی۔ اگر جہاد کو آج فرضِ کفایہ مان لیا جائے تب بھی افغانستان میں جاری جہاد پوری دنیا کے تمام مسلمانوں پر اس وقت تک فرض رہے گا جب تک کہ اس فریضے کی ادائیگی اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ جاتی۔ یعنی جب تک دشمن کو افغانستان (اور اسی طرح عراق، شیشان، کشمیر اور تمام دیگر مسلم مقبوضات) سے نکال باہر نہیں کر دیا جاتا، پوری امت ترکِ جہاد کا گناہ سمیٹتی رہے گی۔ اس لئے کہ کفار اگر مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں تو فرض یہ چیز نہیں ہوتی کہ ان کے خلاف ہلکی پھلکی مزاحمت جاری رکھی جائے، بلکہ انھیں مسلمانوں کی سرزمین سے باہر نکالنا اصل فریضہ ہوتا ہے، (اور جب تک یہ ہدف حاصل نہ ہو جائے جہاد ہر ایک پر فرض رہتا ہے)۔ ایک اور بات بھی آج کل اکثر سننے کو ملتی ہے:

''جہادِ افغانستان کو پیسوں کی ضرورت ہے، لوگوں کی نہیں''۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات میں سرے سے کوئی وزن نہیں۔ اگر جہادِ افغانستان کو افراد کی ضرورت نہ ہوتی اور مجاہدین کی تعداد کافی ہوتی تو کیا چھے سال گزر جانے کے بعد بھی دشمن افغانستان میں بیٹھا ہوتا؟ کیا پچاس (۵۰) لاکھ مسلمان افغانستان سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے؟ کیا ستر (۷۰) لاکھ مقامی آبادی کو اپنے گھروں سے بھاگ کر افغانستان کے اندر ہی پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لینے کی ضرورت پڑتی؟ استاذ سیاف (اللہ اسے ہدایت دے) نے اسی بارے میں کہا تھا:

''آج چودہ ممالک مل کر ہمارے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں، جن میں سوویت اتحاد، میثاقِ وارسو کے حلیف اور بین الاقوامی اشتراکیت سرفہرست ہیں، جب کہ پوری اسلامی دنیا ابھی تک اسی بحث میں الجھی ہوئی ہے کہ جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ اب تک افغانستان

میں دس سے پندرہ لاکھ مسلمان شہید ہو چکے ہیں، مگر یہ لوگ غالباً اس بات کے منتظر ہیں کہ افغانستان میں بسنے والا آخری مسلمان بھی شہید ہو جائے، شاید تب انھیں یقین آ جائے گا کہ جہاد واقعی فرضِ عین ہو گیا ہے''۔

اہلِ افغانستان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ: ''ہمارے درمیان عالمِ اسلام کے ایک مہمان مجاہد کا موجود ہونا ہمیں لاکھوں ڈالروں سے زیادہ محبوب ہے''۔

استاذ سیاف (اللہ اسے ہدایت دے) نے علماء اور داعی حضرات کے نام ایک پیغام دیا ہے، جو مجلّہ 'جہاد کے انیسویں شمارے میں چھپا ہے۔ اس پیغام کا متن ذیل میں دیا جا رہا ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم و رحمة الله و برکاتہ الحمد للّٰہ و الصلاة و السلام علی رسول اللّٰہ و علی آله و صحبه و من اهتدی بهدیه، اما بعد:

آپ لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ افغانستان میں جہاد شروع ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے اور الحمد للہ یہ جہاد ابھی تک جاری ہے۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلامی حکومت کا قیام ہی جہادِ افغانستان کا اصل ہدف ہے، مگر اس ہدف کے حصول کے لئے ایسے مجاہدین درکار ہیں جو دینِ اسلام کا گہرا فہم رکھتے ہوں اور جہاد کے اصلی اسلامی تشخص کی حفاظت کر سکتے ہوں۔ آج ایسے علماء اور داعیوں کی اشد ضرورت ہے جو مجاہدین کی دینی تربیت کا کام مستقل طور پر سنبھالیں۔ میں یہاں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ افغانستان میں موجود علمائے کرام اور مربّیوں کی ایک بہت بڑی تعداد میدانِ جہاد میں شہید ہو چکی ہے۔ لہٰذا ہمیں ایسے افراد کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے جو مجاہدین کے مدارس، تربیتی معسکرات اور محاذوں پر درس و تدریس اور دینی و فکری تربیت کا کام سنبھالیں، تاکہ ہم اپنے مطلوبہ اہداف حاصل کر سکیں۔ بلاشبہ آج ہمیں کسی بھی میدان کے ماہرین اور متخصّصین سے بڑھ کر علماء اور داعی حضرات کی ضرورت ہے۔ اللہ ہمیں اور آپ کو اسلام و اہلِ اسلام کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کا بھائی، عبدالرّب رسول سیّاف

(پکتیا، جاجی ۳ شوال، ۱۴۰۵ھ)

باب پنجم

جہاد کے لئے اجازت لینا کب ضروری ہے؟

باب پنجم

جہاد کے لئے اجازت لینا کب ضروری ہے؟

والدین، شوہراور قرض خواہ سے اجازت کا مسئلہ

اجازت مانگنے کے شرعی حکم کا دارومدار دشمن کی صورتِ حال پر ہے، لہٰذا:

ا۔ اگر دشمن اپنے علاقے تک ہی محدود ہو، سرحدوں پر فوج بھی جمع نہ کر رہا ہو، نہ ہی مسلم ممالک پر کسی بھی طور پر اثر انداز ہو رہا ہو اور مسلمانوں کی سرحدوں پر دفاع کے لئے کافی تعداد میں سپاہ بھی موجود ہو تو ایسی حالت میں جہاد فرضِ کفایہ ہوتا ہے۔ جب جہاد فرضِ کفایہ ہو تو اجازت لینا لازم ہوتا ہے، کیونکہ والدین اور شوہر کی اطاعت فرضِ عین ہے، اور فرض عین کو فرضِ کفایہ پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ اگر دشمن مسلمانوں کی سرحدوں پر حملہ کر دے یا کسی اسلامی سرزمین میں گھس آئے، تو جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، ان حالات میں اس علاقے کے باسیوں اور ان کے قرب و جوار میں رہنے والوں پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اجازت کی شرط ساقط ہو جاتی ہے اور کسی کا کسی دوسرے کو اجازت دینے یا نہ دینے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ایسے میں اولاد والدین کی، بیوی شوہر کی اور مقروض قرض خواہ کی اجازت کے بغیر نکلیں گے۔ اجازت طلب کرنے کی ضرورت اس وقت تک ساقط ہی رہے گی جب تک کہ دشمن مسلمانوں کی سرزمین سے نکال نہیں دیا جاتا یا جب تک مجاہدین کی اتنی تعداد جمع نہیں ہو جاتی جو دشمن کو نکالنے کے لئے کافی ہو، خواہ اس کے لئے کرۂ زمین پر بسنے والے تمام ہی مسلمانوں کو نکلنا پڑے۔ جہاد جب فرضِ عین ہو جائے تو اسے والدین کی اطاعت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے حالانکہ والدین کی اطاعت بھی (عام حالات میں) فرض عین ہے۔ اس فوقیت کی وجہ یہ ہے کہ جہاد دین کی حفاظت کا ذریعہ ہے، جب کہ والدین کی

اطاعت سے ایک یا دو انسانی جانوں کا تحفظ اور دیکھ بھال مقصود ہے، مگر چونکہ ''دین کی حفاظت'' (حماية الدين)، ''انسانی جان کی حفاظت'' (حماية النفس) سے زیادہ اہم ہے اس لئے جہاد کو اطاعتِ والدین پر ترجیح دی جائے گی۔ خود جہاد کس چیز کا نام ہے؟ اسی کا کہ ایک مجاہد ''تحفظِ دین'' کی خاطر اپنی ''جان'' تک قربان کر دیتا ہے اور شہادت کا عالی رتبہ پالیتا ہے۔ نیز، جہاد کے لئے نکلنے سے دین کی حفاظت ہونا ایک یقینی امر ہے، جب کہ یہ محض ایک ظنّی بات ہے کہ جہاد کے لئے نکلنے سے والدین کو کوئی نقصان پہنچے گا، اور بلاشبہ (فقہی قاعدے کے مطابق) ''یقین'' کو ''ظن'' پر ترجیح حاصل ہے۔

فرضِ کفایہ اور فرضِ عین کی مثال

فرض کیجیے کہ کچھ لوگ ساحلِ سمندر پر سیر کر رہے ہیں جن میں سے بعض پیراکی کے ماہر بھی ہیں، کہ اتنے میں انھیں ایک ڈوبتا ہوا بچہ مدد کے لئے پکارتا نظر آتا ہے۔ کوئی پیراک بھی اسے بچانے کے لئے پانی میں نہیں کودتا۔ بالآخر جب ایک پیراک ہمت کر کے آگے بڑھنے لگتا ہے تو اس کے والد اسے منع کر دیتے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیے، کیا دنیا کا کوئی فقیہ یہ کہے گا کہ اس صورتِ حال میں بھی اس شخص کو اپنے والد کی اطاعت کرنی چاہیے اور بچے کو ڈوبتا چھوڑ دینا چاہیے؟

افغانستان کے حالات پر یہی مثال صادق آتی ہے۔ آج افغانستان میں معصوم بچے ذبح اور عزتیں پامال ہو رہی ہیں، بے قصور لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے، لاشوں کے ٹکڑے ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسے میں جب یہ سرزمین مدد کے لئے پکارتی ہے اور کچھ مخلص نوجوان اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہر سمت سے ان پر تنقید کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے اور ہر کوئی ان سے یہی کہتا ہے کہ ''بھلا تم والدین کی اجازت کے بغیر کیسے نکل سکتے ہو؟''

حق تو یہ ہے کہ ڈوبتے ہوئے بچے کو بچانا ساحل پر کھڑے تماشا دیکھنے والے ہر پیراک پر فرض ہے۔ جب تک کوئی پیراک اس کی مدد کے لئے آگے نہ بڑھے، تب تک تمام ہی پیراکوں سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ بچے کو بچائیں، اور سبھی پر ایسا کرنا فرض ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک شخص

آگے بڑھ کر اس فرض کی تکمیل کر دے تو باقی سب کے کندھوں سے گناہ کا بوجھ ہٹ جاتا ہے، لیکن اگر کوئی بھی آگے نہ بڑھے تو تمام پیراک ہی گناہ گار ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ بچے کو بچانے کے لئے والدین سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اگر والدین خود منع کریں تب بھی ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔ اس لئے کہ فرضِ کفایہ شروع میں فرضِ عین ہی کی طرح سب پر لازم ہوتا ہے البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ فرضِ عین کے برعکس، اگر بعض لوگ فرضِ کفایہ ادا کر دیں تو باقی لوگ گناہ گار نہیں ہوتے اور کوئی بھی ادا نہ کرے تو سب کے سب گناہ گار ہوتے ہیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''پس جب دشمن حملہ آور ہو جائے تو کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں بچتی، کیونکہ اس بات پر تو امت کا اجماع ہے کہ (مسلمانوں کے) دین، جان اور حرمت کو حملہ آور دشمن کے شر سے بچانا فرض ہے''۔

(الفتاوی الکبری: ۶۰۷/۴)

الغرض، جہاد اگر فرضِ عین ہو تو والدین سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ فرضِ کفایہ کی صورت میں ان سے اجازت لینا ضروری ہے۔ ذیل میں دی گئی دونوں احادیث کو جمع کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے:

۱۔ صحیح بخاریؒ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَاْذَنَهُ فِی الْجِهَادِ فَقَالَ: اَحَیٌّ وَالِدَاکَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَفِیْهِمَا فَجَاهِدْ))

(بخاري: کتاب الجهاد والسير: باب الجهاد باذن الأبوين)

''ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے جہاد کرنے کی اجازت چاہی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس شخصؓ نے کہا، جی ہاں، فرمایا: پھر تم ان (کی خدمت) میں ہی جہاد کرو''۔

(یہ حدیث ان حالات سے متعلق ہے جب جہاد فرضِ کفایہ ہو اور اس بات کی دلیل ہے کہ فرضِ کفایہ جہاد

میں والدین سے اجازت لینا ضروری ہے۔ (مترجم))

۲۔ابنِ حبانؒ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ہی روایت کرتے ہیں:

((جَاءَ رَجُلٌ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَسَالَهُ عَنْ اَفْضَلِ الْاَعْمَالِ، قَالَ: اَلصَّلَاةُ، قَالَ: ثُمَّ مَهْ؟ قَالَ: اَلْجِهَادُ، قَالَ: فَاِنَّ لِيْ وَالِدَيْنِ، فَقَالَ: اٰمُرُكَ بِوَالِدَيْكَ خَيْرًا، فَقَالَ: وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ نَبِيًّا لَاُجَاهِدَنَّ وَ لَاَتْرُكَنَّهُمَا، قَالَ: فَاَنْتَ اَعْلَمُ))

(فتح الباري:١٠٦/٦، وهذا الحديث مروي في صحيح ابن حبانؒ و مسند أحمدؒ)

''ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے افضل ترین عمل کے بارے میں پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز۔ اس نے پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: جہاد۔ اس نے کہا: میرے والدین بھی (زندہ) ہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ اس نے کہا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے! میں ضرور جہاد کروں گا اور ضرور ہی ان دونوں (یعنی اپنے والدین) کو چھوڑ کر نکل جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا: تو تم بہتر جانتے ہو''۔

یہ حدیث ابنِ حبانؒ نے روایت کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی اسے فتح الباری میں ذکر کیا ہے اور اس کی صحت پر سکوت اختیار کیا ہے۔ چنانچہ یہ حدیث حسن یا صحیح ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''دونوں حدیثوں میں موافقت پیدا کرتے ہوئے، اس (مؤخر الذکر) حدیث مبارکہ کو ان حالات پر منطبق کیا جائے گا جب جہاد فرض عین ہو جائے''۔

(فتح الباري:١٠٦/٦)

(والدین سے اجازت کے معاملے پر مزید بحث کے لیے باب ہفتم دیکھئے۔ (مترجم))

شیخ، استاد یا مربی سے اجازت کا مسئلہ

سلف وخلف کے کسی فقیہ نے یہ بات نہیں لکھی کہ شیخ، استاد یا مربی کو کوئی ایسا حق حاصل ہے کہ ان کے شاگرد عبادات کے معاملے میں ان سے اجازت طلب کریں، چاہے وہ عبادت فرضِ عین ہو یا فرضِ کفایہ۔ جس کسی کو بھی اس بات سے اختلاف ہے وہ کوئی شرعی نص یا واضح دلیل لے کر سامنے آئے۔

ہر مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے شیخ یا مربی کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے نکلے، کیونکہ اللہ ربّ العالمین کی اجازت کو ہر دوسری اجازت پر ترجیح حاصل ہے، اور اللہ نے جہاد کی محض اجازت ہی نہیں دی، اس کی فرضیت کا حکم بھی نازل فرمایا ہے۔

ابنِ ہبیرہؒ فرماتے ہیں:

''شیطان کی چالوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ انسان کے سامنے معنوی بت کھڑے کر دیتا ہے، اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص پر حق واضح ہو جاتا ہے، مگر وہ کہتا ہے: 'ہمارے مذہب میں تو یہ نہیں ہے'، یا وہ حق کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کی بات مانتا ہے جو اس کے نزدیک قابلِ تعظیم ہے''۔

(العقد الیاقوتیة:۱۰۴)

کافر ممالک جانے پر کیوں اعتراض نہیں کیا جاتا؟!

حقیقت یہ ہے کہ اگر آج کوئی طالبِ علم سائنس، طب یا تاریخ وغیرہ کے مضامین پڑھنے کے لئے یورپ یا امریکا جانا چاہے اور اپنے شیخ اور مربی سے اجازت لئے بغیر ہی نکل پڑے، تو نہ ہی کوئی اعتراض کریں گے نہ کوئی اور شخص۔ حالانکہ ان کافر ممالک میں فتنے منہ کھولے بیٹھے ہیں، ایمان دشمن ظلمتیں ہر سمت چھائی ہوئی ہیں، خواہشاتِ نفسانی کی بے قابو موجیں ہر آنے والے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں اور بے حیائی کی ہیجان انگیز فضا کچھ اس انداز میں حیوانی جذبات بھڑکاتی ہے کہ دلوں میں حبِ الٰہی کی آگ کے بجائے حب الشہوات کی نارِ نمرود جل اٹھتی ہے۔

اس کے برعکس، اگر یہی طالبِ علم رباط کے لئے گھر سے نکلے یا جہاد میں شرکت کے لئے محاذ کا رخ کرے تو سب اس پر برس پڑتے ہیں اور ہر زبان پر یہی سوال ہوتا ہے کہ ''تم بلا اجازت کیسے جا سکتے ہو؟'' شاید اس کے شیخ نے اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر توجہ دینے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی:

((حَرَسُ لَيْلَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَفْضَلُ مِنْ اَلْفِ لَيْلَةٍ يُقَامُ لَيْلُهَا وَ يُصَامُ نَهَارُهَا))
(رواه ابن ماجه وطبراني وبيهقي و صححه الحاكم وأقره الذهبي، وقال الحافظ: اسناده حسن. أنظر: الفتح الرباني: ١/٩٥، مختصر مسلم: ١٠٧۵)

''اللہ کی راہ میں ایک رات پہرہ دینا ایک ہزار راتوں سے افضل ہے جن میں رات کو قیام کیا جائے اور دن میں روزے رکھے جائیں''۔

اسی طرح صحیح مسلم میں روایت ہے کہ:

((رِبَاطُ يَوْمٍ وَّ لَيْلَةٍ خَيْرٌ مِّنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَّ قِيَامِهٖ، وَ اِنْ مَاتَ جَرٰى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِىْ كَانَ يَعْمَلُهُ وَ اُجْرِىَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ وَ اَمِنَ الْفَتَّانَ))
(صحيح مسلم: كتاب الامارة: باب فضل الرباط في سبيل الله عزّ وجلّ)

''ایک دن رات رباط (یعنی محاذ پر پڑاؤ) میں گزارنا پورا مہینہ روزے رکھنے اور قیام کرنے سے بہتر ہے اور اگر وہ (رباط کرنے والا) شخص مر جائے تو اس کا یہ عمل جو وہ کیا کرتا تھا برابر جاری رہے گا اور اسے رزق کی فراہمی بھی شروع کر دی جائے گی اور وہ (قبر کے) فتنے سے محفوظ رہے گا''۔

اور صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَغَدْوَةٌ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا))
(بخاري: كتاب الجهاد و السير، مسلم: كتاب الامارة)

''اللہ کی راہ میں ایک صبح یا شام کا نکلنا دنیا اور اس میں موجود ہر چیز سے بہتر ہے''۔

شیخ اور ان کے تلامذہ، استاد اور ان کے شاگردوں، سب کو چاہیے کہ وہ اعمال صالحہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور نیکیوں میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ انھیں چاہیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت کبھی نہ بھولیں:

((اغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: حَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَشَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ))

(رواه البيهقي والحاكم، وهو صحيح، أنظر: صحيح الجامع الصغير للألباني، رقم: ١٠٨٨)

"پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے، اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے، اپنی فراغت کو اپنی مصروفیت سے پہلے، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے اور اپنے غنیٰ کو اپنے فقر سے پہلے"۔

انھیں اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی غور کرنا چاہیے:

((قِيَامُ سَاعَةٍ فِي الصَّفِّ لِلْقِتَالِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ قِيَامِ سِتِّيْنَ سَنَةٍ))

(رواه أحمد والحاكم والدارمي، أنظر: صحيح الجامع الصغير للألباني رقم: ٤٣٠٥)

"قتال فی سبیل اللہ کے لئے صف میں ایک پہر کھڑے ہونا، (عبادت کے لئے) ساٹھ سال قیام کرنے سے بہتر ہے"۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

أجمع المسلمون على أن من استبان له سنة عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لم يحل له أن يدعها لقول أحد.

"اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ جس شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت واضح ہو جائے، اس کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی کے بھی کہنے پر اسے ترک کرے"۔

باب ششم

جہاد بالمال کی فرضیت

باب ششم

جہاد بالمال کی فرضیت

بلاشبہ جان سے جہاد کا مرتبہ مال سے جہاد کی نسبت زیادہ اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے والے صاحبانِ ثروت کو بھی اپنی جانیں جہاد میں کھپانے سے معاف نہیں رکھا گیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کی واضح مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

اپنی جان سمیت جہاد میں شرکت اسی لئے ضروری ہے کہ جسم و روح کی جو اعلیٰ تربیت ونشو ونما دشمن کے خلاف عملی معرکے میں ہوتی ہے، وہ کہیں اور نہیں ہوتی۔ جب ہی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

((وَعَلَيْكَ بِالْجِهَادِ فَإِنَّهُ رَهْبَانِيَّةُ الْإِسْلَامِ)) ''اور تم پر لازم ہے کہ جہاد کرتے رہنا کیونکہ بلاشبہ یہ اسلام کی رہبانیت ہے''۔

(حديث صحيح، رواه أحمد. أنظر: صحيح الجامع الصغير للألباني، رقم:۴۳۰۵)

اور یہی وجہ تھی کہ جب ایک صحابیؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا:

اَيُفْتَنُ الْمَرْءُ فِيْ قَبْرِهٖ؟

''کیا (مجاہد) بندے کو قبر میں آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا:

كَفٰى بِبَارِقَةِ السُّيُوْفِ عَلٰى رَاْسِهٖ فِتْنَةً.

''(نہیں، بلکہ) اس کے سر پر تلواروں کا چمکنا ہی اس کی آزمائش کے لئے کافی ہے''۔

(حديث صحيح رواه النسائي ، أنظر: صحيح الجامع الصغير للألباني، رقم:۴۳۵۹)

اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد چھوڑ کر دنیا میں مگن ہو جانے سے خبردار فرمادیا اور

ایک مرتبہ ہل کے دھاری دھار لوہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ هٰذَا بَیْتَ قَوْمٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الذُّلَّ)) (رواه البخاري في صحيحه: سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، رقم: ١٠)

''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ چیز کسی گھر میں داخل ہوئی تو اللہ نے ساتھ ہی وہاں ذلت بھی داخل نہ فرمادی ہو''۔

جب اسلام کی بقا کا مسئلہ درپیش ہوتو دنیاوی مصروفیات میں مشغول ہوکر رہ جانا شریعت کی نگاہ میں حرام اور مہلک گناہ ہے

ایک اور صحیح حدیث میں روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا تَبَایَعْتُمْ بِالْعِیْنَةِ وَ اَخَذْتُمْ اَذْنَابَ الْبَقَرِ وَ رَضِیْتُمْ بِالزَّرْعِ وَ تَرَکْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ ذُلًّا لَا یَنْزِعُهٗ حَتّٰی تَرْجِعُوْا اِلٰی دِیْنِکُمْ)) (رواه أبو داود، أنظر: سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، رقم: ١١)

''جب تم عینہ (یعنی سودی لین دین) کرنے لگو گے اور گائے بیلوں کی دمیں پکڑ لوگے، اور کھیتی باڑی (کی زندگی) میں (مگن ہوکر) مطمئن ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ بیٹھو گے تو اللہ تمہارے اوپر ایسی ذلت مسلط کردے گا جو وہ اس وقت تک نہیں ہٹائے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف واپس نہ لوٹ آؤ''۔

ایک اور موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی:

((لَا تَتَّخِذُوا الضَّیْعَةَ فَتَرْغَبُوْا فِی الدُّنْیَا)) (ترمذي: كتاب الزهد عن رسول الله، حديث صحيح، أنظر: سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني: ١٢)

''جائیدادیں مت بناؤ (اور پیشے مت اپناؤ) ورنہ تم دنیا کی محبت و رغبت میں مبتلا ہو جاؤ گے''۔

حدیث میں وارد ہونے والے لفظ ''ضیعة'' کا مطلب ہے ''جائیداد'' یا ''پیشہ''۔

مذکورہ بالا احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام تر متاعِ دنیا کا ذکر فرما دیا ہے اور

ہماری مصروفیات کے سارے ہی اسباب گنوا ڈالے ہیں، یعنی زراعت، ربا اور سودی حیلوں والی تجارت، حیواناتی پیداوار، صنعت وحرفت اور کوئی بھی دوسرا پیشہ۔

ایک ایسے وقت میں جب اسلام کی بقا کا مسئلہ درپیش ہو، امتِ مسلمہ اپنی زندگی وموت کا معرکہ لڑ رہی ہو، ان دنیاوی مصروفیات میں مشغول ہوکر رہ جانا شریعت کی نگاہ میں حرام اور مہلک گناہ ہے۔

جہاد بالمال بھی فرضِ عین ہوجاتا ہے

جہاں تک ''جہاد بالمال'' کا تعلق ہے، تو جب بھی مجاہدین کو مال کی ضرورت ہو یہ فرضِ عین ہو جاتا ہے، چاہے اس وقت ''جہاد بالنفس'' بجائے خود فرضِ کفایہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے: ایسے حالات میں یہ فرض عورتوں پر بھی عائد ہوتا ہے، حتیٰ کہ چھوٹے بچوں کا مال بھی فی سبیل اللہ خرچ کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ (الفتاوی الکبری: ۴/۶۰۷)

اسی لئے مال جمع کر کر کے رکھنے کو بھی ایسے حالات میں حرام قرار دیا گیا ہے جب اس کی ضرورت ہو۔

ایک طرف قحط زدگان، دوسری طرف جہاد کی ضروریات؟!

جب امام ابنِ تیمیہؒ سے پوچھا گیا:

''اگر مال تھوڑا پڑ جائے اور ایک طرف قحط زدہ بھوکے ہوں اور دوسری جانب جہاد کی ضروریات ہوں جنھیں پورا نہ کرنے سے جہاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو ترجیح کسے دی جائے؟''

آپؒ نے جواباً فرمایا:

''ہم جہاد کو ترجیح دیں گے، چاہے قحط زدہ لوگوں کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو جائے۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ ''مسئلہ تترُّس'' (یعنی کفار کے مسلمان قیدیوں کو بطور ڈھال استعمال کرنے کے مسئلے) کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ تترُّس کے مسئلے میں مسلمان ہمارے فعل سے قتل ہوتے ہیں، جب کہ ان (قحط زدگان) کی موت اللہ کے فعل سے واقع

ہوتی ہے''۔

(الفتاوی الکبری: ۶۰۷/۴)

(مراد یہ کہ اگر ڈھال بنائے گئے مسلمانوں کو مجبوراً مارنا جائز ہے تو جہاد کی ناگزیر ضرورتوں کے موقع پر قحط زدگان کو مرتے ہوئے چھوڑ دینا بدرجہ اولی جائز ہوگا۔ یاد رہے کہ اگر کفار مسلمان قیدیوں کو بطور ڈھال استعمال کریں اور کفار کو پچھاڑنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ ہو کہ مسلمان بھی ساتھ ہی مارے جائیں، تو فقہاء حملہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (مترجم))

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

''تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر مسلمانوں کو کوئی مالی ضرورت پیش آجائے اور اس وقت تک زکوۃ ادا کی جا چکی ہو، تو لوگوں پر فرض ہوگا کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنا ذاتی مال خرچ کریں''۔

(القرطبي: ۲۴۲/۲)

اسی طرح امام مالکؒ فرماتے ہیں:

يجب على الناس فداء أسراهم و إن استغرق ذلك أموالهم.

''مسلمانوں پر اپنے قیدیوں کو چھڑوانا فرض ہے، خواہ ان کا سارا مال ہی اس کام میں کھپ جائے''۔

امام قرطبیؒ، امام مالکؒ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس بات پر بھی تمام علمائے امت کا اجماع ہے''۔

(القرطبي: ۲۴۲/۲)

اسلام کی نگاہ میں دین کا تحفظ، جان کے تحفظ سے، جب کہ جان کا تحفظ مال کے تحفظ سے زیادہ اہم ہے۔ پس دولت مند لوگوں کا مال مجاہدین کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں کہ وہ اسے بچا بچا کر رکھیں۔

اگر مال دار لوگ محض اپنے ایک دن کا خرچ افغان مجاہدین کو دے دیں

صاحبانِ ثروت اپنے مال کے بارے میں اللہ کے حکم کی طرف متوجہ ہوں۔ آج جہاد کو مالی معاونت کی اشد ضرورت ہے۔ مسلمانوں کا دین و ایمان خطرے میں ہے اور ان کی بستیوں کی

بستیاں فنا ہوتی نظر آرہی ہیں، مگر کتنے ہی اغنیاء اب بھی اپنی خواہشات میں غرق ہیں۔ اگر یہ مال دار لوگ محض ایک دن کے لئے اپنی خواہشات کو روکیں، اپنے آرام و آسائش پر پیسہ برباد کرنے سے باز رہیں اور انھی پیسوں کا رخ افغانستان میں برسرِ پیکار مجاہدین کی طرف پھیر دیں.... ان مجاہدین کی طرف جو سردی سے مر رہے ہیں، جن کے برہنہ پیروں کو برف چاٹ گئی ہے، جن کے پاس کھانے کو دو وقت کی روٹی تک نہیں، نہ ہی اپنے دفاع اور تحفظ کے لئے اسلحہ ہے.... میں کہتا ہوں کہ اگر مال دار لوگ محض اپنے ایک دن کا خرچ ان افغان مجاہدین کو دیں، تو ان شاء اللہ یہ بظاہر معمولی سی قربانی بہت بڑی تبدیلی کا باعث ہوگی اور فتح و نصرت کی جانب پیش قدمی کا مؤثر ذریعہ بنے گی۔

اب تو اس دور کے بہت سے جید علماء یہ فتویٰ دے چکے ہیں کہ افغانستان کے مجاہدین کو زکوٰۃ دینا قربِ الٰہی کا ذریعہ بننے والے عظیم ترین افعال میں سے ہے اور اس کا شمار صدقے کی افضل ترین صورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ فتویٰ دینے والوں میں شیخ عبدالعزیز بن باز بھی شامل ہیں۔

خلاصۂ بحث

اول: آج دنیا کے ہر مسلمان پر اپنی جان سے جہاد کرنا فرضِ عین ہے۔

دوم: آج کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو جہاد پر جانے کی اجازت دے یا اس سے منع کرے۔ چنانچہ اولاد کو والدین سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

سوم: جہاد بالمال بھی آج فرضِ عین ہے، اور جب تک جہاد کو مال کی ضرورت ہے مسلمانوں کے لئے حرام ہے کہ وہ مال جمع کر کر کے رکھیں۔

چہارم: بلاشبہ جہاد ترک کرنا نماز روزہ ترک کرنے کی طرح ہی ہے۔ بلکہ آج کے حالات میں ترکِ جہاد کا گناہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ابنِ رشد نے اس بات پر تمام علماء کا اتفاق نقل کیا ہے کہ اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس کی فرضیت، فرض حج سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔

بابِ ہفتم

سوالات، جو اکثر ذہنوں میں اٹھتے ہیں!

باب ہفتم

سوالات، جو اکثر ذہنوں میں اٹھتے ہیں!

پہلے چند ابتدائی باتیں

آج جہاد کی فرضیت نماز روزے کی مانند، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہے

ان سارے دلائل کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی جان سے جہاد کرنا آج فرضِ عین ہے اور اس کی فرضیت نماز روزے ہی کی مانند، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ امام ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

فالعدو الصائل الذي يفسد الدين والدنيا لا شيء أوجب بعد الايمان من دفعه.

''ایمان لانے کے بعد سب سے اہم فریضہ دین و دنیا کو برباد کرنے والے حملہ آور دشمن کو پچھاڑنا ہے''۔

(الفتاوی الکبری:۴/۶۰۸)

(دفاعی جہاد کے اہم ترین فرض ہونے سے یہ مراد قطعاً نہیں کہ جہاد ہمیشہ نماز سے زیادہ اہم ہوتا ہے، کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ نماز ہمیشہ فرضِ عین ہوتی ہے اور اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ہے، جب کہ جہاد کے معاملے میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں بلکہ دفاعی جہاد کے اہم ترین فرض ہونے کا تعلق تو عدو صائل کے حملے کے موقع سے ہے، جب جہاد عام حالات کے برخلاف فرضِ عین ہو جاتا ہے۔

رہی بات یہ کہ اہم ترین فرضِ عین اللہ تعالیٰ کی توحید کی معرفت اور اقرار ہے تو یہ بات یقیناً درست ہے، لیکن یہاں یہ اعتراض اس لئے خارج از بحث ہے کہ جہاد کے حکم کے مخاطب ہی وہ لوگ ہیں جو پہلے سے عقیدہ توحید پر ایمان لا چکے ہیں۔ خود جہاد بھی توحید اور اس کی دعوت کی بالادستی کا ذریعہ ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ بِالسَّيْفِ حَتَّى يُعْبَدَ اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ...)) (احمد: مسند المکثرین) ''مجھے قیامت تک کے لیے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جانے لگے....''

جہاں تک ایمان کی تفصیلی معرفت (ایمانِ مفصل) کا تعلق ہے جو دراصل علم کا ثمرہ ہے، تو اس کا حصول فرضِ کفایہ کی

حیثیت رکھتا ہے۔ احکام توحید کی تفصیلی تعلیم کی بھی یہی حیثیت ہے۔اس لئے اگر جہاد فرض عین ہو تو اس تعلیم کو مقدم رکھنا درست نہ ہوگا۔ تاہم توحید کے جن موضوعات کی تعلیم ناگزیر ہو تو اسے حسب موقع جہاد کے ساتھ جاری رکھا جائے گا۔ جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں جو سنن ترمذی اور مسند احمد میں درج ہے، وارد ہے کہ غزوہ حنین میں جو نئے مسلمان شریک جہاد تھے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے درخت (ذات انواط) کے تعین کا مطالبہ کیا، جیسا مشرکین نے اپنے لئے مقرر کر رکھا تھا، وہ اس کے پاس معتکف رہتے اور اپنا اسلحہ آویزاں کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:... قلتم والذی نفسی بیده كما قالت بنو اِسرَائِيل لِمُوسى ﴿ اجعل لَنا الها كما لَهُم الهة قال اِنَّكُم قومٌ تجهلُون ﴾..." اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم نے ایسی ہی بات کی جیسی کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی: (اے موسیٰ!) ہمارے لئے بھی کوئی معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے جیسے ان (کفار) کے یہ معبود ہیں، فرمایا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے"۔

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب مسلمانوں کو اپنے ساتھ شریک جہاد کیا۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے ایمان لانے والوں اور صرف توحید و رسالت کی بنیادی گواہی دینے والوں کو بھی جہاد میں شرکت پر ابھارا اور شہادت ملنے پر جنت کی بشارت دی۔ (مترجم)

دفاعی جہاد کے اہم ترین فرضِ عین ہونے کے دلائل

جہاد کے دوران نماز کو مؤخر کر کے دو وقت کی نمازیں جمع بھی کی جا سکتی ہے۔ نماز کی رکعات مختصر کرنا بھی جائز ہے اور ادائیگی نماز کی کیفیت تبدیل کرنے کی بھی اجازت ہے۔ صحیحین میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق کے موقع پر فرمایا:

((مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوتَهُمْ وَ قُبُورَهُمْ نارًا كما شَغَلُونا عَنْ صَلاةِ الْوُسطى حتّى غابَتِ الشَّمْسُ)) (بخاري: كتاب الدعوات: باب الدعاء على المشركين)

"اللہ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے جیسے انھوں نے ہمیں صلاۃ وسطیٰ (یعنی نماز عصر) پڑھنے کا موقع نہیں دیا، یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا"۔

اسی طرح ایک مجاہد کو رمضان میں روزہ چھوڑنے کی اجازت بھی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ کی جانب سفر کے

دوران (وقت سے پہلے) روزہ کھول لیا اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

((اِنَّکُمْ مُصَبِّحُوا عَدُوِّکُمْ وَالْفِطْرُ اَقْوٰی لَکُمْ فَافْطِرُوْا))
(مسلم: كتاب الصيام)

''بے شک صبح تمہیں اپنے دشمن سے ٹکرانا ہے اور روزہ کھول (کر کچھ کھا) لینا تمہارے لئے زیادہ قوت کا باعث ہوگا، لہٰذا روزہ کھول لو''۔

فرضِ عین میں اجازت لینے یا دینے کا سوال ہی نہیں

ہم یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ جہاد جب فرضِ عین ہو جائے تو اس کی ادائیگی کے لئے کسی سے اجازت نہیں مانگی جاتی۔ جس طرح نمازِ فجر ادا کرنے کے لئے نہ والدین سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اپنے شیخ سے، نہ ہی (قبیلے، جماعت یا مُلک کے) سربراہ سے، اسی طرح جہاد پر جانے کے لئے بھی کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں۔ مثلاً اگر کوئی باپ بیٹا ایک ہی گھر میں سو رہے ہوں اور بیٹا اٹھ کر نمازِ فجر ادا کرنا چاہے اور باپ سوتا رہے، تو کیا آپ میں سے کوئی بھی یہ کہے گا کہ بیٹے کو نماز کے لئے اپنے باپ سے اجازت طلب کرنا ضروری ہے؟ یہ تو ایک مسئلہ ہوا۔
اب ذرا ایک لمحے کے لئے یہ فرض کرلیں کہ یہ باپ اپنے بیٹے کو نمازِ فجر پڑھنے سے منع کر دیتا ہے، تا کہ اس کے جاگنے سے باقیوں کی نیند خراب نہ ہو، یا اس لئے کہ باپ کو نماز سرے سے پسند ہی نہیں، یا کسی بھی اور وجہ سے، تو کیا ایسے میں بیٹے کے لئے باپ کی بات ماننا جائز ہوگا؟ اس سوال کا جواب تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اپنے احکامات میں واضح فرما چکے ہیں۔

ترکِ جہاد کا حکم دینا خالقِ کائنات کی نافرمانی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ))
(متفق عليه، أنظر: صحيح الجامع الصغير للألباني، رقم: ۲۳۹۶۷،۲۳۷۹)

''اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ)) ”اللہ عزوجل کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت (جائز) نہیں“۔

(حديث صحيح، رواه أحمد والحاكم)

نیز یہ فرمایا:

لَا طَاعَةَ لِمَنْ لَمْ يُطِعِ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ. ”کوئی اطاعت نہیں کی جائے گی اس شخص کی جو اللہ عزوجل کی اطاعت نہ کرے“۔

(حديث صحيح، رواه أحمد: صحيح الجامع الصغير للألباني: ٧٣٧٩،٣٩٦٧)

چونکہ جہاد ترک کرنا خالقِ کائنات کی نافرمانی ہے، اس لئے مخلوق میں سے چاہے کوئی بھی اس کا حکم دے، اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

جہاد کے لئے اجازت طلب کرنے کی شرعی حیثیت کو مزید واضح کرنے کے لئے میں اللہ سے توفیق مانگتے ہوئے چند باتیں کہنا چاہوں گا:

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ تو یہی تھا کہ جب ایک بار جہاد کا علم بلند کر دیا جاتا اور امت کے لئے نفیرِ عام کا اعلان کر دیا جاتا تو آپ حضرات جہاد میں شرکت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں مانگتے تھے۔ صحابہؓ تو جہاد کی نیت کرنے اور جنگ کے لئے نام لکھوا دینے کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن طلب کرنے آتے تھے، جس کی حیثیت جہاد میں شرکت کے لئے اجازت کی نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ تو دراصل جہاد میں اپنے کردار سے متعلق مشورہ ہوتا تھا، جس کی روشنی میں ہر صحابیؓ اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرتے تھے۔

امام احمدؒ اور امام نسائیؒ کی روایت کردہ صحیح حدیث میں معاویہ بن جاہمہ السلمیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت جاہمہؓ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا:

يَا رَسُولَ اللّٰهِ! اَرَدْتُ الْغَزْوَ وَجِئْتُ اَسْتَشِيرُكَ.

”اے اللہ کے رسولؐ! میں قتال میں شرکت کا ارادہ کر چکا ہوں اور آپ سے مشورہ لینے آیا ہوں“۔

فَقَالَ: هَلْ لَکَ مِنْ اُمٍّ؟

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تمہاری والدہ (زندہ) ہیں؟''

فَقَالَ: نَعَمْ.

''صحابیؓ نے فرمایا: جی!''

فَقَالَ: اَلْزِمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلَيْهَا.

''تو آپؐ نے فرمایا: انھی کے پاس رہو، کیونکہ بلاشبہ جنت ان کے قدموں میں ہے''۔

(نيل الأوطار للشوكاني: ۸/۳۷)

جب کہ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

''اِنِّیْ اِسْتَکْتَبْتُ فِیْ غَزْوَةِ...'' ''میں نے اپنا نام (فلاں) غزوے میں لکھوادیا ہے...''

یہ معاملہ تب ہے جب جہاد فرضِ کفایہ ہو۔ لیکن جب جہاد فرضِ عین ہو جائے اور شریعت سب ہی لوگوں سے نکلنے کا مطالبہ کرے، تو ایسے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد (سے پیچھے رہ جانے) کے لئے اجازت طلب کرنے کو منافقت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ○ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ﴾ (التوبة: ۴۴-۴۵)

''جو لوگ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو آپ سے اجازت نہیں مانگتے کہ (پیچھے رہ جائیں، بلکہ چاہتے ہیں کہ) اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کریں اور اللہ متقی لوگوں سے خوب واقف ہے۔ اجازت تو وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے شک میں ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں''۔

اسی طرح ہمارے علم میں ایسی کوئی بات بھی نہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یا تابعینؒ، رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین، یعنی حضراتِ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جہاد میں شرکت کے لئے اجازت مانگا کرتے تھے۔ کیا آپ کے خیال میں جہاد میں شریک ہونے والا ہر شخص پہلے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پاس جا کر اجازت طلب کرتا تھا؟ یقیناً ایسا کبھی نہیں ہوا، کیونکہ علمِ جہاد کا بلند ہو جانا اور لشکر کا میدان میں نکل آنا ہی اصل اہمیت کا حامل ہوتا ہے، جس کے بعد کسی سے اجازت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اجازت کا معاملہ تو دشمن پر حملے کی تدبیر و ترتیب وغیرہ سے متعلق ہے

اس سے بعد کے ادوار میں بھی ہمیں ایسی کوئی بات نہیں ملتی کہ مسلمان رباط یا جہاد کی عبادت ادا کرنے کے لئے پہلے امیر المؤمنین سے اجازت حاصل کرتے تھے۔ نہ ہی ہمیں پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسا واقعہ نظر آتا ہے جب مسلمانوں کے امیر نے بلا اجازت جہاد و قتال کرنے کے ''جرم'' میں کسی شخص کو سزا دی ہو۔

اجازت تو عین قتال میں یا دشمن پر حملے کے وقت، جہاد کے امیر یا معرکے کے قائد سے لی جاتی ہے، (جس کا مقصد یہ پوچھنا نہیں ہوتا کہ ''میں جہاد میں شرکت کروں یا نہیں؟'' بلکہ) یہ اجازت جہاد میں کود پڑنے کے بعد امورِ جہاد کو منظم اور منضبط انداز سے چلانے کے لئے لی جاتی ہے، تاکہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص قبل از وقت (اور بے ترتیب انداز میں) حملہ کر کے مجاہدین کی ساری منصوبہ بندی ہی خراب نہ کر ڈالے۔

امام اوزاعیؒ اور بعض دیگر فقہاء کے نزدیک اجازت کی ضرورت صرف ان لوگوں کو ہے جو باقاعدہ فوج کا حصہ ہوں اور انھیں بیت المال سے تنخواہ ملتی ہو۔ رملیؒ فرماتے ہیں:

یکره الغزو بغیر إذن الامام أو نائبه و لا کراهة فی حالات:

۱. إذا فوت الإستئذان المقصود.

۲. أو عطل الإمام الغزو.

۳. أو غلب علی ظنه عدم الإذن، کما بحث ذلک البلقینی.

'' امام یا اس کے نائب کی اجازت کے بغیر دشمن کے خلاف لڑنا مکروہ ہے، لیکن ان (تین) حالات میں کوئی کراہت نہیں:

۱۔ جب امیر نے جہاد کو معطل کر رکھا ہو۔

۲۔ جب اجازت مانگنے سے اصل مقصد ہی فوت ہو جائے، (مثلاً جب یہ نظر آ رہا ہو کہ اگر اجازت ملنے کا انتظار کیا گیا تو مسلمانوں کا نقصان ہو جائے گا یا دشمن کارروائی کر کے بھاگ نکلے گا، وغیرہ وغیرہ)

۳۔ جب غالب گمان یہی ہو کہ امیر اجازت نہیں دے گا، جیسا کہ بلقینیؒ نے بھی فرمایا ہے۔

(نهاية المحتاج: ۶۰/۸)

میں اپنی بات پھر دہراؤں گا کہ یہ سب احکامات ان حالات کے لئے ہیں جب جہاد فرضِ کفایہ ہو۔ لیکن جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تب اجازت مانگنا یا دینا، کچھ باقی نہیں رہتا۔

ابنِ رشد فرماتے ہیں:

طاعة الإمام لازمة وإن كان غير عدل ، ما لم يأمر بمعصية ، ومن المعصية النهي عن الجهاد المتعين.

'' امام غیر عادل ہی کیوں نہ ہو اس کی اطاعت ضروری ہے، جب تک کہ وہ معصیتِ الٰہی کا حکم نہ دے۔ اور جہاد کے فرضِ عین ہو جانے کے بعد جہاد سے روکنا معصیت ہی ہے''۔

(أنظر: فتح العلى المالك للشيخ عليش: ۳۹۰/۱)

جب تک مجاہدین کی تعداد نا کافی ہو، اجازت مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

اس مسئلے کی مزید وضاحت کرنے کے لئے میں یہ بتاتا چلوں کہ فرضِ کفایہ میں بھی اجازت مانگنے یا دینے کا سوال تب ہی کھڑا ہوتا ہے جب '' کفایت'' پوری ہو جائے، یعنی جب فریضۂ جہاد کی ادائیگی کے لئے مجاہدین کی تعداد کافی ہو جائے۔ لیکن اتنی تعداد جمع ہونے سے پہلے جہاد کا حکم سب ہی کے لئے ہوتا ہے اور جب تک کچھ لوگ اس فرض کو ادا نہیں کر دیتے جہاد سب پر فرض رہتا ہے۔ یعنی

''کفایت'' کے پورے ہونے سے پہلے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا جب تک ''کفایت'' پوری نہیں ہوتی، فرضِ کفایہ جہاد کے لئے بھی کسی سے اجازت نہیں مانگی جائے گی۔ اجازت دینے لینے کا سوال تب کھڑا ہوگا جب ہمیں معلوم ہو جائے کہ ارضِ معرکہ میں مجاہدین کی اتنی تعداد جمع ہو چکی ہے جو فریضۂ جہاد کی ادائیگی کے لئے کافی ہے۔

عین ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ ساری باتیں پڑھنے کے بعد کہے کہ: ہمیں یقین آ گیا ہے کہ جہاد آج فرضِ عین ہے، اور اس کے لئے کسی سے اجازت لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، لیکن چند اہم سوالات پھر بھی باقی ہیں:

۱۔ کیا نفیرِ عام کے حکم کی عملی تطبیق آج کے حالات میں بھی ممکن ہے؟

۲۔ کیا ہم ان حالات میں بھی کفار کے خلاف جہاد کریں جب کہ مسلمانوں کے پاس کوئی ایک متفقہ امیر یا خلیفہ نہیں ہے؟

۳۔ کیا ہم افغانستان کے قتال میں شریک ہوں حالانکہ مجاہدین مختلف گروہوں اور قیادتوں میں بٹے ہوئے ہیں؟

۴۔ اگر سب لوگ جہاد چھوڑ بیٹھیں تو کیا ایک مسلمان تنہا ہی قتال کرے؟

۵۔ کیا ہم ایسے مسلمانوں کے ساتھ بھی مل کر قتال کریں جن کی دینی تربیت ناقص ہے؟

۶۔ کیا ہمارے لئے کمزوری کے عالم میں کفار سے مدد طلب کرنا جائز ہے؟

پہلا سوال

کیا نفیرِ عام کے حکم کی عملی تطبیق آج کے حالات میں بھی ممکن ہے؟

اسلام نے نفیرِ عام کا جو حکم دیا ہے، یعنی یہ کہ سب لوگ جہاد کے لئے نکل آئیں، حتیٰ کہ بیوی شوہر سے (محرم ساتھ ہونے کی شرط کے ساتھ!) اور بیٹا والد سے اجازت لئے بغیر ہی نکل پڑے، بعض لوگوں کے خیال میں اس حکم پر عمل درآمد تقریباً ناممکن ہے۔ اور اس کی وجوہات کچھ اس طرح

گنوائی جاتی ہیں کہ:

۱۔ اگر سب لوگ ہی جہاد کے لئے نکل آئیں تو کوئی بھی اسلامی سرزمین ایسی نہیں جہاں مسلمانوں کی کل تعداد کا عشرِ عشیر بھی سما سکے۔

۲۔ اگر سب لوگ جہاد کے لئے نکل پڑیں تو لوگوں کی دینی تربیت کا کام متاثر ہوگا، حالانکہ یہی تربیت امتِ مسلمہ کو تباہی سے بچانے کی آخری امید ہے۔

۳۔ اگر ہر شخص فلسطین، افغانستان اور دیگر مقبوضہ سرزمینوں کا رخ کر لے تو پیچھے مسلمانوں کے اپنے علاقوں میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا جس سے سیکولر، قوم پرست، اشترا کی اور بعثی عناصر فائدہ اٹھائیں گے۔

جواب: اگر مسلمان نفیرِ عام سے متعلق اپنے ربّ کا حکم اور اپنی شریعت کا فیصلہ محض ایک ہفتے کے لئے نافذ کریں، صرف ایک ہفتہ اس پر پوری طرح عمل کریں تو فلسطین نجس یہودیوں سے پاک ہو جائے۔ اگر پوری کی پوری امت جہاد کے لئے اٹھ کھڑی ہو تو افغانستان سے کافروں کو نکال باہر کرنے کے لئے بھی بہت زیادہ وقت درکار نہیں ہوگا۔ اور تھوڑے سے عرصے کے لئے جہاد پر نکل جانے سے نہ تو معاشرے میں کسی داعی کی کمی ہوگی، نہ مسلمان خواتین کے نکلنے سے ان کے گھر زمین پر آ پڑیں گے۔

لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ہر مرتبہ بیٹھے انتظار کرتے ہیں، تماشا دیکھتے ہیں یہاں تک کہ کفار ایک اور اسلامی سرزمین پر قابض ہو جاتے ہیں۔ پھر جب قبضہ ہو چکتا ہے تو ہم چیخ دھاڑ کر، خطبے جھاڑ کر، آنسو بہا کر اور آہیں بھر بھر کے اس کا سوگ مناتے ہیں۔

ہمارے ذہنوں میں قوم پرستانہ تصورات راسخ ہیں؟!

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ہمارے ذہنوں پر قوم پرستانہ تصورات غالب آجاتے ہیں اور ہماری نگاہیں وہ مصنوعی سرحدیں پار نہیں کر پاتیں جو معاہدۂ

سائیکس پیکو نے ہمارے لئے کھینچی تھیں یا جان انتون نامی برطانوی یا کسی اور فرانسیسی کافر نے جن کا تعین کیا تھا! آخر کیا وجہ ہے کہ شام کی سرحد پر واقع اردن کے شہر ''رمثا'' میں رہنے والا مسلمان اردن ہی کے ایک اور شہر ''عقبہ'' میں رہنے والے شخص سے گہری وابستگی کا احساس رکھتا ہے اور اس کے بارے میں ایسے ہی فکر کرتا ہے جیسے ایک مسلمان بھائی کی فکر ہونی چاہیئے، حالانکہ ''عقبہ'' اس سے چھے سو (۶۰۰) میل کے فاصلے پر ہے؟ لیکن یہی مسلمان سرحد پار شام کے علاقے ''درعا'' میں بسنے والے شخص کے بارے میں نہ ایسے جذبات رکھتا ہے، نہ اس کی فکر کرتا ہے، حالانکہ ''درعا'' اس سے محض دس (۱۰) میل کی مسافت پر ہے۔ یہ فرق کیوں ہے جب کہ ''درعا'' (شام) اور ''عقبہ'' (اردن) دونوں کے باشندے مسلمان ہیں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ''درعا'' میں رہنے والا دوسرے شخص سے زیادہ دین دار اور پابندِ شرع ہو؟ بلاشبہ یہ رویے ہمارے ذہنوں میں راسخ قوم پرستانہ تصورات ہی کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا سوال

کیا ہم ان حالات میں بھی کفار کے خلاف جہاد کریں جب کہ مسلمانوں کا کوئی ایک متفقہ امیر یا خلیفہ نہیں ہے؟

جی ہاں، امیر نہ ہو تب بھی جہاد کرنا ہماری ذمہ داری بنتی ہے! یہ بات تو کسی نے بھی نہیں کہی کہ اگر مسلمانوں کا ایک متفقہ امیر نہ ہو تو جہاد کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس، ہم دیکھتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے دوران اور تاتاریوں کے خلاف جہاد میں مسلمانوں کے ہر علاقے میں علیحدہ امیر ہوتا تھا، بلکہ بعض اوقات ایک علاقے میں بھی ایک سے زیادہ امراء ہوتے، مگر اس کے باوجود مسلمانوں نے ان کے خلاف جہاد کیا۔ مثلاً اُس وقت حلب میں علیحدہ امیر تھا، دمشق میں علیحدہ اور مصر میں تو ایک سے زیادہ امراء تھے، جن میں سے بعض تو مسلمان امراء کے خلاف بھی صلیبیوں سے مدد طلب کرتے ہوئے نہیں شرماتے تھے۔ جیسا کہ ''شاور'' نے مصر کے ایک اور امیر ''ضرغام'' کے خلاف صلیبیوں سے مدد حاصل کی۔ لیکن مسلمانوں نے ان میں سے کسی بات کو بھی جہاد سے منہ پھیرنے کا عذر نہیں بنایا۔

آج تک کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ ایسے حالات میں جہاد کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، یا ''مسلمانوں کی سرزمین سے کفار کو باہر نکالنا'' فرض نہیں رہتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے میں جہاد کی فرضیت پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

اندلس میں بھی مسلمانوں کی صورتِ حال اس سے بہت مختلف نہیں تھی۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

وہ گروہوں میں بٹ چکے تھے

اور ہر محلے میں ایک نیا امیر المؤمنین اور ایک نیا منبر تھا

اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے:

جس چیز نے سرزمینِ اندلس سے میرا دل اُچاٹ کیا

وہ بادشاہوں کا اپنے لئے معتمد اور معتضد جیسے بلند و بالا القابات اختیار کرنا تھا

ایسے القابات جن کے وہ سرے سے مستحق ہی نہ تھے

بالکل اس بلی کی طرح جو منہ پھلا کر، پنجوں کے بل کھڑی ہو کر خود کو شیر ظاہر کرنا چاہے

لیکن اس انتشار کے باوجود علماء میں سے کسی نے نہیں کہا کہ ان حالات میں کوئی جہاد نہیں ہوتا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اندلس میں تو علماء خود اگلی صفوں میں لڑتے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی معرکے میں امیر کی طرف سے متعین کردہ کوئی قائد نہ ہو، جیسا کہ غزوۂ موتہ کے موقع پر ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعین کردہ تینوں قائدین کی شہادت کے بعد، حضرت خالد بن ولیدؓ اٹھے اور انھوں نے علم سنبھال لیا، حالانکہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعین نہیں کیا گیا تھا، اور اللہ نے انھیؓ کے ہاتھوں مسلمانوں کے لشکر کو بچا نکالا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف آپؓ کے اس فعل کو درست قرار دیا بلکہ آپؓ کی تعریف بھی فرمائی۔

خود خلافت کے قیام کا اصل راستہ بھی جہاد ہے

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی امام یا امیر المؤمنین کا وجود ہی نہ ہو، لیکن نہ تو اس سے قتال کی فرضیت پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ ہی ''مسلمانوں کی سرزمینوں سے کفار کو نکالنے'' کا فرض ساقط ہوتا ہے

ولا ننتظر حتىٰ تقوم الولاية الكبرى وتستأنف الخلافة، لأن الولاية العامة و الخلافة لا تأتى نظريا بالثقافة و الدراسة، بل الجهاد أسلم طريقة لكي تصبح الولاية الخاصة ـ أى: إمارة القتال ـ ولاية العامة و الخلافة.

ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم بیٹھ کر ''ولایتِ کبریٰ'' کے قائم ہونے اور خلافت کے لوٹنے کا انتظار کریں، کیونکہ اسلامی خلافت عملی دنیا سے کوسوں دور بیٹھ کر علوم وفنون پر عبور حاصل کرنے اور بہت کچھ پڑھ لینے سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کے قیام کا تو اصل رستہ جہاد ہے، جس کے ذریعے ''ولایتِ خاصہ'' یعنی قتال کی امارت، ''ولایتِ عامہ'' یعنی خلافت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اگر کسی وقت مسلمانوں کا کوئی خلیفہ یا امیر المؤمنین نہ ہو، تو مجاہدین کیا کریں؟

اگر کسی وقت مسلمانوں کا کوئی خلیفہ یا امیر المؤمنین نہ ہو، تو مجاہدین خود اپنے میں سے کسی ایک شخص کو امیر چن لیں گے۔ وہی ان کے معاملات کو منظم کرے گا، ان کی شیرازہ بندی کرے گا اور ان کے درمیان باہمی تعاون کا ذریعہ بنے گا۔

ایک صحیح حدیث میں صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے، آپؓ فرماتے ہیں:

((بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ سَرِيَّةً فَسَلَّحْتُ رَجُلاً سَيْفًا، قَالَ: فَلَمَّا رَجَعَ قَالَ: مَا رَأَيْتُ مِثْلَ مَا لَامَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، قَالَ: اَعَجَزْتُمْ اِذْ بَعَثْتُ رَجُلاً فَلَمْ يَمْضِ لِاَمْرِىْ اَنْ تَجْعَلُوْا مَكَانَهُ مَنْ يَّمْضِىْ لِاَمْرِىْ))

((رواه أبو داود و أحمد وصححه حاكم

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریّہ روانہ فرمایا۔ پس میں نے (سریّے میں شریک) ایک شخص کو تلوار سے مسلح کیا۔ پھر آپؓ فرماتے ہیں کہ: جب وہ شخص واپس آیا تو اس نے (مجھے سریّے کی روداد سناتے ہوئے) کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کسی کو یوں ملامت کرتے نہیں دیکھا جیسے انھوںؐ نے ہمیں ملامت کی ہے۔ آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ جب میں کسی شخص کو (امیر بنا کر) بھیجوں اور وہ میرے حکم کے مطابق نہ چلے تو تم اس کی جگہ کسی ایسے شخص کو (امیر) بنا لو جو میرے حکم کے مطابق چلے''۔

ووافقه الذهبي. أنظر: الفتح الرباني: ۴۱/۴۵)

اس واقعے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو اس بات پر ابھارا کہ اگر ضرورت پڑے تو ایسے امیرِ لشکر کو بھی بدل ڈالیں جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مبارک ہاتھوں سے علم تھما چکے ہوں، اور اس کی جگہ نیا امیر مقرر کر لیں۔ تو جہاں سرے سے ہی کوئی امیر نہ ہو، کیا وہاں امیرِ جہاد مقرر کرنے کی ضرورت شدید تر نہیں ہو جاتی؟

امام کی عدم موجودگی کی وجہ سے جہاد مؤخر نہیں کیا جائے گا

امام ابنِ قدامہؒ ''المغني'' میں فرماتے ہیں:

فإن عدم الإمام لم يؤخر الجهاد لأن مصلحته تفوت بتأخيره.

''پس امام کی عدم موجودگی کی وجہ سے جہاد مؤخر نہیں ہوگا، کیونکہ تاخیر کرنے سے جہاد کی مصلحت ہی فوت ہو جاتی ہے''۔

(المغني: ۸/۲۵۳)

اور جب لوگ کسی کو اپنا امیر چن لیں تو اُس کی اطاعت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ ''فتح العلي المالک'' میں لکھا ہے:

نقل الشيخ ميارة: إذا خلا الوقت من الأمير وأجمع الناس رأيهم على بعض كبراء الوقت يمهد سبيلهم و يرد قويهم عن ضعيفهم فقام بذلك قدر الجهد والطاقة. فالظاهر أن القيام عليه لا يجوز، والمعرض يريد شق عصا الاسلام و تفريق جماعته، ففي صحيح مسلم الحديث: ((إِنَّهُ سَتَكُونُ هَنَاتٌ

وَّ هَنَاتٌ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَ هِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَّنْ كَانَ)) (مسلم: كتاب الامارة)

''شیخ میارہؒ نقل کرتے ہیں کہ جب کوئی امیر نہ ہو اور لوگ کسی نمایاں شخصیت پر متفق ہو جائیں (اور اسے اپنا امیر بنالیں)، تاکہ وہ ان کے معاملات سنوارے اور ان کے طاقت ور لوگوں کو کمزوروں پر زیادتی نہ کرنے دے، اور وہ شخص اس کام میں اپنی ساری سعی وقوت بھی لگا رہا ہو، تو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا جائز نہیں ہے۔ یقیناً ایسی حرکت کرنے والا اسلام کی وحدت توڑنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث ہے: ((اِنَّهٗ سَتَكُوْنُ هَنَاتٌ وَّ هَنَاتٌ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَ هِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَّنْ كَانَ)) (مسلم: كتاب الامارة)

''عنقریب بہت فتنہ و فساد ہوگا، پس جو شخص اس امت کے متحد ہونے کے بعد اس کی وحدت کو پھاڑنا چاہے، اس کو تلوار سے مار ڈالو، چاہے وہ کوئی بھی ہو''۔

(فتح العلی المالک: ۳۸۹/۱)

تیسرا سوال

کیا ہم افغانستان کے قتال میں شریک ہوں حالانکہ مجاہدین مختلف گروہوں اور قیادتوں میں بٹے ہوئے ہیں؟

مجاہدین کے مختلف گروہوں اور قیادتوں میں بٹے ہونے کے باوجود افغانستان میں قتال کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، کیونکہ حملہ آور ملحدوں کے خلاف مسلمانوں کے دفاع کا واحد ذریعہ قتال ہی ہے۔ اور ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جو ملحد کافروں کے خلاف اس صورت میں لڑنے سے منع کرتی ہو جب مسلمان ایک سے زائد اسلامی مجموعات اور تنظیمات میں بٹے ہوئے ہوں۔ اگر مجاہدین کے قائدین ایک سے زائد ہوں تو بھی قتال فرض رہے گا اور ہر قائد کو اپنے اپنے مجموعے کا امیرِ قتال تصور کیا جائے گا۔

چوتھا سوال

اگر سب لوگ جہاد چھوڑ بیٹھیں تو کیا ایک مسلمان تنہا ہی قتال کرے؟

جی ہاں، مسلمان کی ذمہ داری تو یہی بنتی ہے کہ اسے تنہا بھی قتال کرنا پڑے تو کرے، کیونکہ اللہ عزوجل اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا﴾ (النسآء: ۸۴)

''پس تم جنگ کرو اللہ کی راہ میں، تم اپنی ذات کے سوا کسی کے ذمہ دار نہیں، البتہ مومنوں کو لڑائی پر ابھارو۔ اللہ سے امید ہے کہ وہ کافروں کے زور کو توڑ دیں گے، اور اللہ سب سے زیادہ زور والے اور سب سے سخت سزا دینے والے ہیں''۔

یہ آیتِ مبارکہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (اور آپؐ کے ہر امتی) کو دو باتوں کا حکم دیتی ہے؛ ا۔ قتال فی سبیل اللہ کا، خواہ تنہا ہی کرنا پڑے۔ ۲۔ مومنوں کو قتال پر ابھارنے کا۔ اور یہ دونوں ہی کام فرض ہیں، کیونکہ جب کسی کام کا حکم دیا جائے تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ اسے پورا کرنا فرض ہے۔

نیز اللہ ربّ العزت نے اس آیتِ مبارکہ میں قتال کی حکمت بھی بیان فرما دی ہے، یعنی ''کفار کا زور توڑنا''، کیونکہ کفار تبھی ہمارے وجود سے خوف زدہ ہوں گے جب ہم ان کے خلاف قتال کرتے رہیں گے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الأنفال: ۳۹)

''اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائے''۔

لہٰذا قتال ترک کرنے سے فتنہ یعنی شرک پھیل جاتا ہے اور کفار غالب آ جاتے ہیں۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سورۂ نساء کی مندرجہ بالا آیت کو انھی ظاہری معنوں میں سمجھا تھا۔

ابو اسحٰق ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

اگر ایک شخص تنہا ہی مشرکوں پر کود پڑے، تو کیا اس کا یہ فعل اپنے آپ کو خود ہی ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے؟

حضرت بَراء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لا! لِاَنَّ اللّٰہَ بَعَثَ رَسُوْلَهٗ فقَالَ: ﴿فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ﴾؛ اِنَّمَا ذَاکَ فِی النَّفَقَةِ.''

نہیں (ایسا نہیں ہے)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور فرمایا: ﴿پس تم جنگ کرو اللہ کی راہ میں، تم اپنی ذات کے سوا کسی کے ذمہ دار نہیں﴾ ''اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے'' والی آیت تو (فی سبیل اللہ) خرچ کرنے سے متعلق ہے''۔

(الفتح الرباني: ۱۴/ ۸؛ رواه أحمد وصححه الحاكم ووافقه الذهبي)

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے اپنے جواب کے آخر میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَةِ﴾

''اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔

چنانچہ دشمن کے خلاف تنہا قتال کرنا ہلاکت نہیں، بلکہ اللہ کی راہ میں (جان و مال) خرچ کرنے سے ہاتھ کھینچ لینا ہلاکت ہے۔

امام ابن العربی ؒ ''أحکام القرآن'' میں فرماتے ہیں:

وقد تكون حالة يجب فيها نفير الكل إذا تعين الجهاد على الأعيان بغلبة العدو على قطر من الأقطار أو لحلوله بالعقر فيجب على كآفة الخلق الجهاد و الخروج، فان قصروا عصوا.

فإذا كان النفير عاما لغلبة العدو على الحوزة أو استيلائه على الأسارى كان النفير عاما و وجب الخروج خفافا و ثقالا، ركبانا و رجالا، عبيدا و أحرارا....،

من كان له أب من غير اذنه و من لا أب له، حتیٰ يظهر دين اللّٰه و تحمی البيضة و تحفظ الحوزة و يخزی العدو و يستنقذ الأسریٰ ولا خلاف في هذا.

فكيف يصنع الواحدإذا قعد الجميع؟ يعمد إلى أسير واحد فيفديه و يغزو بنفسه إن قدر و إلا جهز غازيا.

''ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جب نفیرِ عام (یعنی ہر ایک کا نکلنا) فرض ہو جائے۔لہٰذا دشمن جب مسلمانوں کی کسی سرزمین پر حملہ آور ہو یا ان کے کسی علاقے کو گھیر لے تو جہاد تعین کے ساتھ ہر ایک پر فرض ہو جاتا ہے اور تمام لوگوں کے لئے جہاد کرنا اور اس کی خاطر گھروں سے نکلنا لازم ہو جاتا ہے۔ایسے میں اگر وہ ادائیگیٔ فرض میں کوتاہی کریں تو گناہ گار ہوں گے۔

پس اگر نفیرِ عام کا حکم اس وجہ سے ہو کہ دشمن ہمارے کسی علاقے پر قبضہ کر لے یا مسلمانوں کو پکڑ کر قیدی بنا لے تو سب لوگوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد کے لئے نکلیں اور ہر حال میں نکلیں، خواہ ہلکے ہوں یا بوجھل، سوار ہوں یا پیدل، غلام ہوں یا آزاد....جس کے والد زندہ ہوں وہ ان کی اجازت کے بغیر نکلے اور جس کے والد فوت ہو چکے ہوں وہ بھی نکلے، (اور جہاد کرتا رہے) یہاں تک کہ؛

اللہ کا دین غالب آ جائے، مسلمانوں کی سرزمین سے دشمن کا شر دور ہو جائے، اسلامی سرحدیں محفوظ ہو جائیں، دشمن رسوا ہو جائے، سارے مسلمان قیدی آزاد ہو جائیں...اور اس بارے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

لیکن (سوال یہ ہے کہ) اگر سب لوگ ہی جہاد چھوڑ کر بیٹھے رہیں تو اکیلا بندہ کیا کرے؟

اسے چاہیئے کہ وہ؛ کوئی قیدی تلاش کرے اور پیسے دے کر اسے آزاد کرائے، اور اگر قدرت رکھتا ہو تو اکیلا ہی قتال کرے اور اگر اس کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو تو کسی اور مجاہد کو تیار کرے اور اسے سامان فراہم کرے''۔

(أحکام القرآن:۲/۹۵۴)

تنہا قتال کرنا اللہ ربّ العزت کو بہت خوش کرتا ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ کسی شخص کا تنہا قتال کرنا اللہ ربّ العزت کو بہت خوش کرتا ہے۔ امام احمدؒ اور امام ابوداودؒ یہ حسن حدیث روایت کرتے ہیں:

((عَجِبَ رَبُّنَا عَزَّوَجَلَّ مِنْ رَجُلٍ غَزَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَانْهَزَمَ یَعْنِیْ اَصْحَابُهُ فَعَلِمَ مَا عَلَیْهِ فَرَجَعَ حَتّٰی اُهْرِیْقَ دَمُهُ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی لِمَلاَئِکَتِهِ انْظُرُوْا اِلٰی عَبْدِیْ رَجَعَ رَغْبَةً فِیْمَا عِنْدِیْ وَشَفَقَةً مِمَّا عِنْدِیْ حَتّٰی اُهْرِیْقَ دَمُهُ))

(أبو داود: کتاب الجهاد: فی الرجل یشري نفسه)

''ہمارا عزت وجلال والا رب اس بندے سے خوش ہو جاتا ہے جو اللہ کے رستے میں لڑے، پھر جب وہ پسپا ہو (کر بھاگ) جائیں، یعنی اس کے ساتھی، تو اسے سمجھ آ جائے کہ (فرار حرام ہونے کی وجہ سے) اس پر کیا ذمہ داری بنتی ہے، اور وہ واپس لوٹ آئے اور (لڑتا رہے) یہاں تک کہ اس کا خون بہا دیا جائے تو (ایسے مجاہد کے لئے) اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں:

''دیکھو میرے اس بندے کو! یہ اس (جزا) کی رغبت میں جو میرے پاس ہے اور اس (عذاب) کے خوف سے جو میرے پاس ہے، واپس لوٹ آیا یہاں تک کہ اس کا خون بہا دیا گیا''۔

پانچواں سوال

کیا ہم ایسے مسلمانوں کے ساتھ بھی مل کر قتال کریں جن کی دینی تربیت ناقص ہے؟

کئی لوگ، جن میں بعض مخلصین بھی شامل ہیں، یہ سوال پوچھتے ہیں کہ:

ہم اہلِ افغانستان کے ساتھ مل کر کیسے جہاد کریں، جب کہ ان میں سچے جھوٹے، ہر قسم کے لوگ موجود ہیں، سگریٹ اور نسوار کا استعمال ان کے ہاں عام ہے، ان میں سے بعض تو اپنا اسلحہ بیچ کر بھی پیسہ کمانے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی طرح بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ اہلِ افغانستان کی اکثریت مذہبِ حنفی کے علاوہ کسی مذہب کو برداشت نہیں کرتی اور ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو تعویذ وغیرہ باندھتے ہیں؟

میں ان چیزوں کا شرعی حکم بیان کرنے سے پہلے ایک سوال پوچھنا چاہوں گا:

مجھے پوری دنیا میں کوئی ایک جگہ ایسی دکھا دیں جہاں بسنے والے مسلمانوں میں اس طرح کے مسائل نہ پائے جاتے ہوں؟ تو کیا ہم ان مسائل کی وجہ سے جہاد سے ہاتھ کھینچ لیں اور کفار کو کھلا چھوڑ دیں کہ وہ مسلمانوں کی جس سرزمین پر چاہیں قابض ہو جائیں؟ جہاں چاہیں گھومیں؟

جہاں تک جواب کا تعلق ہے، تو بلاشبہ ایسے لوگوں کے ساتھ مل کر قتال کرنا بھی فرض ہے جن کی دینی تربیت ناقص ہو، کیونکہ قتال کا حکم ''دفع أعظم الضررين'' کے فقہی قاعدے پر مبنی ہے، یعنی یہ اصول کہ ''جب دو ضرر درپیش ہوں، تو ان میں سے زیادہ بڑے ضرر کو دور کرنا ترجیح قرار پائے گا''۔

''مجلة الأحكام العدلية'' میں ایسے کئی فقہی قاعدے ذکر کیے گئے ہیں، مثلاً:

''يتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام''

''ضررِ عام کو دور کرنے کے لئے ضررِ خاص برداشت کر لیا جائے گا''۔

(المادة رقم: ٢٦)

"الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف"

شدید تر ضرر کو کم تر ضرر سے زائل کیا جائے گا''۔

(المادة رقم: ۲۷)

"إذا تعارضت مفسدتان، روعی أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما"

''جب دو مفاسد کا سامنا ہو تو ان میں سے کم تر کو اختیار کر کے زیادہ نقصان دہ مفسدے سے بچا جائے گا''۔

(المادة رقم: ۲۸)

"یختار أهون الشرین"

''جب دو میں سے ایک خرابی کو اختیار کرنا ناگزیر ہو تو کم تر خرابی کو اختیار کیا جائے گا''۔

(المادة رقم: ۲۹)

چنانچہ اس معاملے میں بھی کم تر خرابی کو اختیار کرنا لازم ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ زیادہ بڑی خرابی کون سی ہے؟ کفار کا افغانستان پر قابض ہونا اور اسے ایک کافر ملک بنا کر وہاں قرآن اور اسلام کو ممنوع قرار دے دینا، یا پھر ایک ایسی قوم کے ساتھ مل کر جہاد کرنا جس میں بعض کمزوریاں یا گناہ پائے جاتے ہوں؟

قتال ہر نیک اور فاجر مسلمان کے ساتھ مل کر کیا جائے گا

امام ابنِ تیمیہؒ ''مجموع الفتاوی''میں فرماتے ہیں:

''لہٰذا اہلِ سنت والجماعت کے اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ قتال ہر نیک اور فاجر (یعنی بد عمل مسلمان) کے ساتھ مل کر کیا جائے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((...إِنَّ اللّٰهَ لَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ)) ''...یقیناً اللہ کسی فاجر بندے سے بھی اس دین کو تقویت پہنچا دیتے ہیں''۔

(بخاري: كتاب الجهاد و السير: باب ان اللّٰه يؤيد الدين بالرجل الفاجر)

اور یہ بھی کہ:

((إنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى سَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّيْنَ بِأَقْوَامٍ لَا خَلَاقَ لَهُمْ))
(مسند أحمد: أول مسند البصريين)

''یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ اس دین کو ایسی قوموں سے بھی تقویت پہنچائیں گے جن کا بھلائی میں کوئی حصہ نہ ہوگا''۔

پس جب قتال صرف فاجر امراء یا فاجر لشکر کے ساتھ مل کر ہی کرنا ممکن ہو تو ہمارے دو ہی رستے باقی بچتے ہیں:

یا تو ان کے ساتھ قتال میں شریک نہ ہوا جائے، مگر ایسا کرنے سے وہ (کفار) غالب آجائیں گے جو ہمارے دین و دنیا، دونوں کے لئے ان (فاجر مسلمانوں) سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہیں۔ یا پھر فاجر امیر (یا فاجر لشکر) کے ساتھ مل کر قتال کیا جائے، اور ایسا کرنے سے زیادہ بڑے فجار (یعنی کفار) کو پچھاڑا جاسکے گا اور اگر سب نہیں، تو بیشتر اسلامی شعائر بھی قائم ہوسکیں گے۔ لہٰذا ایسی صورت میں یا اس سے ملتی جلتی دیگر صورتوں میں یہ دوسری راہ اختیار کرنا ہی فرض ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ کے ادوار میں بھی بہت سی جنگیں اسی طرح لڑی گئیں۔ (یعنی اسلام میں نئے نئے داخل ہونے والے لوگ گروہ در گروہ بغیر کسی لمبی چوڑی تعلیم و تربیت کے جہاد میں کود پڑے، اور صحابہؓ نے اُن کے ساتھ مل کر ہی جہاد کیا۔ (مترجم))

نیز، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِيْ نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ الْاَجْرُ وَ الْمَغْنَمُ))
(بخاري: كتاب الجهاد والسير: الجهاد ماض مع البر والفاجر)

''گھوڑے کی پیشانی میں بھلائی رکھ دی گئی ہے جو قیامت تک اس کے ساتھ رہے گی، (یہ بھلائی ہے جہاد کا) اجر اور مالِ غنیمت''۔

(مجموع الفتاوى: ۵۰۶/۲۸)

پس جب تک افغانستان میں بسنے والے لوگ مسلمان ہیں ان کے ساتھ مل کر قتال کرنا فرض ہے۔افغانستان میں بلند کیا جانے والا علمِ جہاد اسلامی ہے اور وہاں برسر پیکار مجاہدین کا اعلان کردہ ہدف بھی ''زمین پر اللہ کے دین کا قیام'' ہے،لہٰذا آج جہادِ افغانستان سے منہ پھیرنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔

شریعت کے اسی حکم پر عمل نہ کرنے کا نقصان ہم فلسطین میں اٹھا رہے ہیں۔اگر ابتدائی دور کی تمام تر خرابیوں کے باوجود،مسلمان فلسطین میں جہاد کرتے تو یہ کبھی بھی ہمارے ہاتھوں سے نہ نکلتا۔ مگرامتِ مسلمہ اس وقت حرکت میں نہ آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے حالات بہت بگڑ گئے اور جارج حبش، نائف حواتمہ اور فادر کیپیسی کے آنے کے بعد رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ جہاں تک افغان مجاہدین کی قیادت کا تعلق ہے،تو وہ سب کے سب نماز پڑھتے ہیں،روزے رکھتے ہیں،دینی شعائر قائم کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اسلام ہی سے منسوب کرتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کا کوئی بھی گروہ کفار،اہلِ کتاب یا ملحدوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو جب تک وہ (مجاہدین) مسلمان رہیں،ان کے ساتھ مل کر قتال کرنا فرض ہے،خواہ وہ کتنے ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہوں۔

امام شوکانیؒ ''نیل الأوطار''میں فرماتے ہیں:

و تجوز الاستعانة بالفساق علی الكفار إجماعا.

''اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کافروں کے خلاف فاسقوں سے مدد لینا جائز ہے''۔

(نیل الأوطار: ۴۴/۸)

چھٹا سوال

کیا کمزوری کے عالم میں ہمارے لئے کفار سے مدد طلب کرنا جائز ہے؟

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ جہادِ افغانستان کے لئے امریکا اور مغربی ممالک سے مدد طلب کرنی چاہیئے۔اسی طرح بعض دیگر لوگوں کا خیال ہے کہ فلسطین میں یہود کے خلاف جہاد کے لئے روس

سے مدد مانگنی چاہیئے۔

میں یہ بات بالکل وضاحت سے کہنا چاہوں گا کہ کفار سے یوں مدد طلب کرنا تمام فقہاء کے نزدیک حرام ہے اور ایسا کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ تمام تر قربانیوں کے باوجود جہاد اپنے حتمی ہدف تک نہیں پہنچ پاتا۔

کفار سے مدد طلب کرنے کے بارے میں کئی احادیث وارد ہوئی ہیں جو بظاہر باہم ٹکراتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ احادیث جو مدد طلب کرنے سے منع کرتی ہیں، ان میں درج ذیل روایات بھی شامل ہیں:

ا۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن ایک مشرک سے فرمایا:

((فَارْجِعْ فَلَنْ اَسْتَعِيْنَ بِمُشْرِكٍ))
(مسلم: كتاب الجهاد و السير)
(نيل الأوطار: ۱۲۸/۷)

''واپس لوٹ جاؤ، کیونکہ میں کسی مشرک سے ہرگز مدد نہیں لیتا''۔

۲۔ ایک اور حدیثِ مبارکہ میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

((اِنَّا لَا نَسْتَعِيْنُ بِالْمُشْرِكِيْنَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ))
(مسند أحمد: مسند المكيّين)
(رواه أحمد و الطبراني. قال الهيثمي في ''مجمع الزوائد'': رجال أحمد و الطبراني ثقات)

''ہم مشرکوں کے خلاف مشرکوں سے مدد نہیں طلب کرتے''۔

جب کہ اس کے برعکس یہ واقعہ بھی صحیح حدیث میں مروی ہے کہ صفوان بن امیہ مشرک ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوے میں شریک ہوا۔ امام نوویؒ ''تهذيب الأسماء واللغات'' میں فرماتے ہیں:

صفوان بن أمية شهد حنيناً مع النبي صلى الله عليه وسلم كافراً.

''صفوان بن امیہ کافر ہوتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوا''۔ (تهذيب الأسماء واللغات:٢٦٣)

نیز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے دن صفوان بن امیہ سے زرہیں بھی ادھار لیں اور اس سے فرمایا:

((عَارِيَةٌ مُؤَدَّاةٌ)) ''(یہ چیزیں) ادھار ہیں (اور تمہیں) واپس کردی جائیں گی''۔

(حديث صحيح، رواه الحاكم.

أنظر: صحيح الجامع، رقم: ٣٩٦٧)

اور اہلِ سیر کے نزدیک یہ واقعہ بھی ثابت ہے کہ اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قزمان نامی شخص بھی غزوے میں شریک ہوا اور اس نے مشرکوں کے تین علم برداروں کو قتل کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قزمان کے بارے میں فرمایا:

((ان الله ليأزر هذا الدين بالرجل الفاجر))

''بے شک اللہ اس دین کی مدد فاجر شخص سے بھی کروالیتا ہے''۔

احادیث کے اس ظاہری تعارض کی وجہ سے اس مسئلے کے بعض پہلوؤں میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ ان تمام احادیث کو جمع کرتے ہوئے علمائے کرام مختلف آراء تک پہنچے ہیں، جن میں سے ایک رائے یہ ہے کہ:

''ابتداء میں مشرکین سے مدد طلب کرنا کلیۃً منع تھا، مگر بعد میں کچھ رخصت دے دی گئی۔ ''التلخيص'' میں حافظؒ کہتے ہیں: امام شافعیؒ نے اس رائے کی تصدیق کی ہے اور اس پر آپؒ کا واضح قول بھی موجود ہے۔'' (نيل الأوطار: ٨/٤٤)

البتہ اس بات پر تو چاروں فقہاء کا اتفاق ہے اگر درج ذیل شرائط پوری ہو رہی ہوں تو کفار سے مدد لینا جائز ہے:

ا۔ اسلام کا حکم ہی غالب ہو، یعنی مسلمان اتنے طاقت ور ہوں کہ اگر وہ مشرک جن سے مدد طلب کی جارہی ہے اور وہ جن کے خلاف مسلمان قتال کررہے ہیں، دونوں اکٹھے ہو جائیں، تب

بھی مسلمان ان سب پر غالب آجائیں۔

۲۔ جن کافروں سے مدد طلب کی جارہی ہو وہ مسلمانوں کے بارے میں اچھی سوچ رکھتے ہوں اور مسلمانوں کو ان سے خیانت کا خدشہ نہ ہو۔ یہ بات ان کے عملی سلوک اور معاملات سے بآسانی پتہ چل سکتی ہے۔

۳۔ جس کافر یا جن کفار سے مدد طلب کی جارہی ہے، مسلمان اُن کی مدد کے واقعتاً محتاج ہوں۔

مسئلہ زیرِ بحث میں مذاہبِ اربعہ کی آراء:

الف۔ حنفیہ کی رائے

امام محمد بن حسنؒ فرماتے ہیں:

لا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرك على أهل الشرك اذا كان حكم الاسلام هو الغالب.

''اگر اسلام کا حکم ہی غالب ہو، تو اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان اہلِ شرک کے خلاف اہلِ شرک سے مدد طلب کریں''۔

(شرح كتاب السيرة ، فقرة:۱۵۲)

امام جصاصؒ فرماتے ہیں:

قال أصحابنا: لا بأس باستعانة بالمشركين على قتال غيرهم من المشركين اذا كانوا متى ظهروا كان حكم الاسلام هو الظاهر.

''ہمارے اصحاب (یعنی احناف) کی رائے یہ ہے کہ: مشرکین کے خلاف قتال میں دیگر مشرکین سے مدد لے لینا جائز ہے، بشرطیکہ جب فتح حاصل ہو تو اسلام کا حکم ہی غالب آئے''۔

(أحكام القرآن للجصاص)

ب۔ مالکیہ کی رائے

ابنِ قاسمؒ فرماتے ہیں:

و لا أرى أن يستعينوا بهم يقاتلون معهم الا أن يكون نواتيه أو خدما.

''میری رائے میں کفار سے یوں مدد لینا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑیں درست نہیں، البتہ اگر وہ بطور ملاح یا خادم ساتھ ہوں تو کوئی حرج نہیں۔''

(المدونة:۲/۴۰)

اسی طرح امام مالکؒ فرماتے ہیں:

لا أرى أن يستعان بالمشركين على المشركين الا أن يكونوا خدما.

''میری رائے میں مشرکین کے خلاف مشرکین سے مدد لینا جائز نہیں سوائے اس صورت میں جب وہ بطور خادم کام کریں''۔

(القرطبي:۸/۱۰۰)

ج۔ شافعیہ کی رائے

امام رملیؒ فرماتی ہیں:

وللامام أو نائبه الاستعانة بكفار ولو أهل الحرب كأن يعرف حسن رأيهم فينا و يشترط لجواز الإستعانة احتياجنا له لنحو خدمة أو قتال.

''امام یا اس کے نائب کے لئے کفار، حتیٰ کہ اہلِ حرب سے بھی مدد لینا جائز ہے، مثلاً (اس صورت میں) جب یہ معلوم ہو کہ (جن) کفار (سے مدد طلب کی جا رہی ہے وہ) ہمارے بارے میں اچھی سوچ رکھتے ہیں۔ مگر یہ مدد طلب کرنا تبھی جائز ہوگا جب ہمیں واقعتاً اس بات کی ضرورت ہو کہ دشمن کے خلاف لڑائی میں یا بطور خادم کوئی ہماری مدد کرے''۔

(نهاية المحتاج:۸/۵۸، و تكملة المجموع :۱۹/۲۸)

د۔حنابلہ کی رائے

امام ابنِ قدامہؒ فرماتے ہیں:

وعن أحمد ما يدل على جواز الاستعانة بالمشرك، بل روي عن أحمد أنه يسهم للكافر من الغنائم اذا غزا مع الامام خلافا للجمهور الذين لا يسهمون له.

''امام احمدؒ سے ایسے اقوال منقول ہیں جو مشرکین سے مدد لینے کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔ بلکہ امام احمدؒ کے بارے میں تو یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جمہور علماء کی رائے کے برخلاف، آپؒ مسلمانوں کے امام کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے والے کافر کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دینے کے بھی قائل تھے''۔

(المغني: ۴۱۴/۸)

باب ہشتم

کفار سے معاہدات

باب ہشتم

کفار سے معاہدات

مراحلِ جہاد کی ترتیب کو سمجھنا بے حد ضروری ہے

کفار سے صلح کے جواز پر قلم اٹھاتے ہوئے بہت سے مصنفین ٹھوکر کھاتے ہیں اور نزولِ احکا[م] کے تاریخی مراحل جانے بغیر ہی قرآنی آیات سے استدلال کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ہمارے لئے اس ترتیب کو جاننا ناگزیر ہے جس کے مطابق جہاد سے متعلق قرآنی احکامات بتدریج نازل ہوتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ کی ''آیتِ سیف'' نازل فرمائی:

﴿ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (التوبة: ٣٦)

''اور ان سب مشرکین سے لڑو جیسا کہ وہ سب تم سے لڑتے ہیں اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کا ساتھی ہے''۔

﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ﴾ (التوبہ: ۵)

''پس جہاں کہیں مشرکوں کو پاؤ انھیں قتل کرو، انھیں پکڑو، ان کا محاصرہ کرو اور ان کے لئے ہر گھات میں تیار بیٹھو''۔

کفار سے قتال کا حکم مطلقاً دیا جاچکا ہے

امام ابنِ قیمؒ (مراحلِ جہاد کے بارے میں) ''زاد المعاد'' میں واضح طور پر لکھتے ہیں:

- مکہ مکرمہ میں جہاد حرام تھا۔
- ہجرت کے موقع پر اس کی اجازت دی گئی۔
- پھر اس کے بعد جہاد کا حکم دیا گیا، مگر صرف ان کے خلاف جو خود جنگ کا آغاز کریں۔
- اور بالآخر تمام کے تمام مشرکین کے خلاف جہاد کا حکم دے دیا گیا۔

امام ابنِ عابدین حنفیؒ فرماتے ہیں:

''جان لو کہ قتال کے احکامات ترتیب سے نازل ہوئے۔ چنانچہ:

ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کرنے اور مشرکین سے اعراض برتنے حکم تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴾ (الحجر: ۹۴)

''پس آپ کو جس بات کا حکم دیا جا رہا ہے وہ صاف صاف سنا دیجئے اور ان مشرکین سے منہ پھیر لیجئے''۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین طریقے سے بحث کرنے کا حکم دیا گیا:

﴿اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَ جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ﴾ (النحل: ۱۲۵)

''آپ اپنے رب کی راہ کی طرف دعوت دیجیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجیے اس طریقے سے جو بہترین ہو''۔

پھر مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی گئی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا ‌ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيۡرُ ﴾ (الحج: ۳۸)

''جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی (مقابلے کی) اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر بہت ظلم کیا گیا ہے اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے''۔

پھر قتال کا حکم دیا گیا، مگر ان حالات کے لئے جب دشمن حملے میں پہل کرے:

﴿ فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ‌ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾ (البقرة: ۱۹۱)

''ہاں اگر وہ خود تم سے لڑیں تو تم بھی انھیں قتل کرو۔ ایسی ہی سزا ہے کافروں کے لیے''۔

پھر اس شرط کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا کہ حرام مہینے گزر چکے ہوں:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾ (التوبة: ۵)	''اور جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو جہاں کہیں مشرکوں کو پاؤ انھیں قتل کرو، انھیں پکڑو، ان کا محاصرہ کرو اور ان کے لئے ہر گھات میں تیار بیٹھو''۔

اور بالآخر کفار کے خلاف قتال کا حکم مطلقاً دے دیا گیا:

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (البقرة: ۱۹۰)	''اور قتال کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے مت بڑھو، یقیناً اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

(حاشية ابن عابدين: ۲۳۹/۳)

لہٰذا نزولِ آیات کے اس زمانی مرحلے کو سمجھنے کی اہمیت صاف ظاہر ہے، جس میں آیتِ سیف کی صورت میں قتال کے حتمی احکامات نازل ہوئے۔

(جب جہاد کے حتمی احکامات نازل کیے جا چکے تو اب کسی کو یہ حق نہیں کہ موجودہ دور کو مکی دور کے مثل قرار دے کر جہاد کو معطل کر دے۔ کیونکہ اس طرح تو آج شراب و سود کی عدم حرمت کا سوال بھی کھڑا ہو جائے گا کہ مکی دور میں یہ بھی حرام نہ تھے۔ جب کہ ہمارے سامنے اللہ کا یہ حکم موجود ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: ۳) ''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر میں رضامند ہو گیا''۔ الغرض ہمارے لئے شریعت کے حتمی احکامات ہی حجت ہیں۔ (مترجم))

خلافتِ اسلامیہ کے قیام سے پہلے، مذاکرات و معاہدات جائز نہیں

میں ابتداء ہی میں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا چاہوں گا کہ دعوت کے ابتدائی مراحل میں، جب اس کے پاس اپنے اصولوں کے تحفظ کے لئے کوئی قوت و اقتدار نہ ہو، کسی قسم کے سیاسی

مذاکرات اور مکالمے کرنا جائز نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ کمزوری کے عالم میں مذاکرات شروع کر دینے سے دعوت کے بنیادی اصول ہی خطرے میں پڑ جاتے ہیں، دعوت اپنے اصل خدوخال بھی برقرار نہیں رکھ پاتی اور حق و باطل کے ایک میز پر اکٹھے بیٹھنے سے لوگ بھی حق کو ٹھیک ٹھیک پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔ انجام کار نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ یہ عظیم دعوت سیاسی کھیل تماشوں اور بین الاقوامی سازشوں میں پھنس کر ضائع ہو جاتی ہے۔ بے شک اس مرحلے کے لیے تو قرآنِ حکیم ہمیں یہ محکم ہدایات دیتا ہے:

﴿قُلْ يَآاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ o لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ o وَ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ...﴾ (الکافرون: ۱-۳)	''کہو، اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو، نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں...''۔

ایسے حالات میں تو ایک مومن کا موقف یہ ہوتا ہے:

﴿قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ o اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِىْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَ هُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ﴾ (الأعراف: ۱۹۵-۱۹۶)	''ان سے کہو کہ بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو، پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ یقیناً میرا حامی و ناصر وہ اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے''۔

پس نتائج سے بے پروا ہو کر، اپنی بنیادی دعوت کا اعلان کر دینا لازم ہے۔ داعیانِ دین کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسلام کی حقیقی دعوت کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور اسے بلا کم و کاست دنیا کے سامنے پیش کر دیں، تاکہ انھیں بھی آزمائش کی بھٹیوں سے گزارا جائے، انھیں بھی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے، یہاں تک کہ پیہم صبر و استقامت کی ایمانی تپش انھیں کندن بنا ڈالے۔

پورے مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی دوٹوک موقف پر جمے رہے۔ ہاں، البتہ ایک مرتبہ اسلامی خلافت قائم ہو جائے تو اس کے بعد معاہدات کرنے میں کوئی شے مانع نہیں ہوتی۔

کفار سے معاہدہ کرنے کی شرائط

کفار سے معاہدۂ صلح کرنے کے مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے:

بعض علماء نے صلحِ حدیبیہ کو مثال بناتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے۔

بعض نے صرف ان حالات کے لئے اجازت دی ہے جب مسلمان انتہائی کمزور ہوں۔

اور بعض نے صلح کرنے کو ہر حال میں ناجائز قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ''آیتِ سیف'' نے کفار کے ساتھ معاہدات کے ہر جواز کو منسوخ کر دیا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ:

اگر کفار سے معاہدہ کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو ایسا کرنا جائز ہے، بشرطیکہ معاہدے کی شروط میں کوئی ایسی بات نہ پائی جاتی ہو جو اس معاہدے کو شریعت کی رُو سے باطل یا فاسد کر ڈالے۔ مثلاً:

ا۔ کوئی ایسی شرط شامل نہ ہو جو مسلمانوں کی گز بھر زمین بھی کفار کو دے

یہ بات کسی طور جائز نہیں کہ معاہدے میں کوئی ایسی شرط شامل ہو جو مسلمانوں کی گز بھر زمین بھی کفار کو دے یا اس پر ان کا قبضہ تسلیم کرے۔ (نهاية المحتاج: ۸/۵۸)

(کفار کو کسی مسلم سرزمین پر اڈے فراہم کرنا بھی اسی اصول کی رو سے حرام ہے۔ (مترجم))

سرزمینِ اسلام چونکہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، اس لیے اسے عملاً کفار کے حوالے کرنا تو بہت دور کی بات ہے، کسی کو یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ وہ اس بارے میں مذاکرات تک کرے۔ ایسی کوئی بھی شرط معاہدے کو باطل کر دیتی ہے، کیونکہ زمین در حقیقت اللہ کی اور پھر اللہ کے دینِ اسلام کی ہے۔ اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی ملکیت میں دخل دے، یا کوئی ایسی چیز بیچے یا تحفے میں دے ڈالے جس کا وہ سرے سے مالک ہی نہیں۔

چنانچہ جب تک روس افغانستان (اور اب شیشان وغیرہ) کا آخری گز تک خالی نہیں کر دیتا،

جب تک یہودی پورے فلسطین سے نکل نہیں جاتے (اور اسی طرح امریکا، برطانیہ اور دیگر صلیبی ممالک عراق وافغانستان سے بھاگ نہیں جاتے، جزیرۂ عرب اور دیگر مسلم علاقوں میں قائم اڈے ختم نہیں کردیتے (مترجم))......تب تک ان میں سے کسی سے بھی مذاکرات کرنا جائز نہیں!

۲۔ جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو دشمن سے صلح کے تمام معاہدے باطل ہو جاتے ہیں

جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو دشمن سے صلح کے تمام معاہدے باطل ہو جاتے ہیں، مثلاً جب دشمن مسلمانوں کی کسی بھی سرزمین پر حملہ کردے یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں ہو تو صلح کا کوئی معاہدہ برقرار نہیں رہتا۔ "فتح العلی المالک" میں صلح اور معاہدات کے موضوع کے تحت "المعیار" کے باب الجهاد کے حوالے سے یہ واضح فتویٰ موجود ہے:

أوقع الخليفة الصلح مع النصارى و المسلمون لا يرون الا الجهاد فمهادنته منقوضة و فعله مردود.

"اگر خلیفہ عیسائیوں سے صلح کے معاہدے پر دستخط کردے، مگر مسلمانوں کو صاف نظر آرہا ہو کہ اس وقت ان کے لیے جہاد ہی کا حکم ہے، تو خلیفہ کی جانب سے کیا گیا معاہدہ ٹوٹ جائے گا اور اس کا یہ فعل مردود ٹھہرے گا"۔

(فتح العلی المالک:۱/۳۸۹)

چنانچہ جہاں کہیں بھی جہاد فرض ہوگا، صلح کرنا جائز نہ رہے گا، مثلاً جب دشمن مسلمانوں پر غالب ہو۔ اسی طرح جہاد کے فرضِ عین ہونے کی دیگر جتنی صورتیں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ان سب میں بھی صلح کرنا منع ہے، کیونکہ صلح کرنے کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد کردہ ایک فرضِ عین، یعنی جہاد کی ادائیگی غلط قرار پائے گی، جب کہ بالادست ہاتھ کفار ہی کا رہے گا، حالانکہ دفاعی جہاد میں تو مطلوب ہی یہ ہوتا ہے کہ کفار کی شوکت توڑ کر مسلمانوں کو ان کے شر سے نجات دلائی جائے۔

قاضی ابنِ رشد نقل کرتے ہیں کہ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس کی فرضیت ''فرضِ حج'' سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ کیونکہ جہاد جب فرض ہو جائے تو اس کی فوری ادائیگی لازم ہوتی ہے، جب کہ حج کو مؤخر کرنے کی شاید پھر بھی کوئی گنجائش موجود ہو۔

کوئی بھی ایسا شخص جو شریعت کے اصولوں پر گہری نگاہ رکھتا ہو، اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ مذکورہ بالا معاہدۂ صلح کو توڑنا فرض ہے کیونکہ ایسا معاہدہ احکاماتِ شریعت سے متصادم ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ نیز یہ معاہدہ فرضِ عین ترک کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے، جو کسی صورت جائز نہیں اور ظاہر ہے کہ ناجائز حکم کی پابندی کبھی لازم نہیں ہو سکتی۔

۳۔ ہر وہ شرط باطل ہے جو شریعت کو معطل کرنے یا شعائرِ دین کی اہمیت گھٹانے کا سبب بنے

ہر وہ شرط باطل ہے جو شریعت کو معطل کرنے یا شعائرِ دین کی اہمیت گھٹانے کا سبب بنے۔ مثلاً: روس (اور اب اسی طرح امریکا و یورپ) سے کوئی ایسا معاہدہ کرنا جائز نہیں جس کے نتیجے میں وہ افغانستان (عراق، بوسنیا اور شیشان وغیرہ) میں قائم ہونے والی حکومتوں میں کسی طور بھی دخل اندازی کر سکیں، کیونکہ ایسا کرنا جہاد پر پانی پھیرنے اور اس کے اہداف کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔

۴۔ شریعت کسی ایسے معاہدے کی اجازت نہیں دیتی جس میں مسلمانوں کی ذلت کا شائبہ تک جھلکتا ہو

شریعت کسی ایسے معاہدے کی اجازت نہیں دیتی جو مسلمانوں کی تذلیل کا باعث بنے، یا جس میں مسلمانوں کی ذلت کا شائبہ تک جھلکتا ہو۔ جیسا کہ امام زُھریؒ یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

''جب (غزوۂ خندق کے موقع پر) ایک طرف مشرکین کا لشکر مستقلاً سروں پر موجود تھا اور دوسری

طرف یہود سے خیانت کا ڈر تھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے گھر بھی محفوظ نہ رہے تھے اور ہر سمت سے ہی حملے کا خوف تھا، جب یہ کٹھن صورتِ حال ختم ہوتی نظر نہ آئی اور) لوگوں پر آزمائش کی شدت بہت بڑھ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ غطفان کے دو سرداروں، عیینہ بن حصن بن حنیفہ بن بدر اور حارث بن ابی عوف المزنی کی طرف اپنا نمائندہ بھیجا اور انھیں اس شرط پر مدینہ کے پھلوں کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ دینے کی پیشکش کی کہ وہ اپنے لشکر کو لے کر واپس لوٹ جائیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مابین صلح کی بات طے ہوگئی، مگر گواہوں کی موجودگی میں معاہدے کو حتمی شکل نہیں دی گئی۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کو حتمی شکل دینے کا ارادہ فرمایا تو آپؐ نے حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ کو بلا بھیجا اور ان سے مشورہ طلب فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تفصیلاً ساری صورتِ حال بتائی اور ان سے یہ بھی فرمایا:

''ہم جانتے ہیں کہ پورا عرب (آپ کے خلاف یکجا ہوکر) ایک ہی کمان سے آپ پر تیر برسا رہا ہے، تو کیا آپ کی رائے میں یہ مناسب ہوگا کہ ہم انھیں مدینہ کے پھلوں میں سے کچھ حصہ دے دیں؟''

صحابہؓ نے جواباً عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپؐ کی یہی رائے ہے تو آپؐ کی رائے کا اتباع کیا جائے گا، لیکن (اگر ایسا نہیں، تو) ہم نے تو کبھی انھیں ایک کھجور تک نہیں دی، الّا یہ کہ یہ ہم سے کچھ خریدیں یا بطور مہمان ہمارے پاس آئیں۔ اور یہ تو اُس وقت کی بات ہے جب ہم کافر تھے، اب تو اللہ نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت بھی بخشی ہے!'' صحابہء کرامؓ کا یہ جواب سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے''۔

(إعلاء السنن: ۸/۱۲، مرسل قوي)

انصارؓ کو صلح کے اس معاہدے میں اپنی تذلیل محسوس ہوئی، چنانچہ انھوں نے صلح کرنا پسند نہ کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اصحابؓ کی اس رائے کو پسند کرتے ہوئے صلح

کرنے سے انکار کر دیا۔ بعض روایات میں صحابہؓ کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

لا نعطیکم الا السیف.

''ہم تمہیں تلوار (کی مار) کے سوا کچھ نہ دیں گے''۔

(أحکام القرآن للجصاص: باب الهدنة و الموادعة)

۵۔ معاہدے میں ایسی کوئی شرط نہیں ہوسکتی جو اسلامی شریعت کے واضح احکامات سے متصادم ہو

معاہدے میں ایسی کوئی شرط نہیں ہوسکتی جو اسلامی شریعت کے واضح احکامات سے متصادم ہو۔

مثلاً:

الف: ایسی شرط جو کفار کو جزیرۂ عرب میں رہنے کی اجازت دے، کیونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارىٰ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا اَدَعَ اِلَّا مُسْلِمًا))

(مسلم: کتاب الجهاد و السیر)

''میں ضرور بالضرور یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال کر دم لوں گا یہاں تک کہ مسلمان کے سوا کسی کو باقی نہیں چھوڑوں گا''۔

(الفتح الربانی: ۱۴/۱۲۰)

ب: ایسی شرط جس کے نتیجے میں کوئی مسلمان عورت کفار کو لوٹائی جائے:

﴿فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ﴾

(الممتحنة: ۱۰)

''پس جب تم جان لو کہ وہ (عورتیں) مسلمان ہیں تو ان کو کفار کی طرف مت واپس کرو کیونکہ نہ تو وہ عورتیں ان کافروں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافر ان عورتوں کے لیے حلال ہیں''۔

البتہ اس مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا کسی مسلمان مرد کو کفار کی طرف لوٹانا جائز ہے یا نہیں؟

بعض فقہاء صلحِ حدیبیہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کی اجازت دیتے ہیں، لیکن بیشتر کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں، اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ صلح حدیبیہ میں مکہ سے مدینہ آنے والے مسلمانوں کو مشرکین کی طرف لوٹا دینے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کی اجازت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کے لئے نجات کی کوئی صورت پیدا فرما دیں گے۔

ہم بھی اسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن تین شرائط پر مشرکین سے صلح کی تھی، جن میں یہ بھی شامل تھیں کہ:

جو مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے مشرکوں کی طرف جائے گا اسے لوٹایا نہیں جائے گا۔

جو مسلمان مشرکوں سے نکل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے گا، اسے واپس کر دیا جائے گا۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((مَنْ ذَهَبَ مِنَّا اِلَيْهِمْ فَابْعَدَهُ اللّٰهُ وَمَنْ جَآءَ نَا مِنْهُمْ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ لَهُ فَرَجًا وَّ مَخْرَجًا))

(مسلم: كتاب الجهاد و السير: صلح حديبية)

''جو کوئی ہم میں سے نکل کر اُن کے پاس جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو دور ہی رکھے اور جو کوئی اُن میں سے نکل کر ہمارے پاس آئے گا تو اللہ اس کے لئے کوئی راستہ نکال دے گا اور اس کی مشکل کو آسان کر دے گا''۔

(دیکھئے: تفسیر القرطبي: ۳۹/۸)

(جولوگ کفار کے ساتھی بن کر مسلمانوں کو دشمن کے حوالے کرتے ہیں وہ صلحِ حدیبیہ کی شرائط میں بھی اپنی حرکتوں کا جواز تلاش نہیں کر سکتے، کیونکہ:

ا۔ یہ وہ اسلامی قیادتیں نہیں ہیں کہ جنھیں مسلمانوں کا نمائندہ بن کر کفار سے معاہدہ کرنے کا حق ہو۔

۲۔ جہاد آج فرضِ عین ہے، اس لیے حملہ آور کفار سے معاہداتِ صلح کرنا اور پر امن سفارتی تعلقات رکھنا ویسے ہی جائز نہیں۔

۳۔ یہ لوگ حالتِ امن میں کسی مسلمان کو کفار کے حوالے نہیں کر رہے، بلکہ اسلام کے خلاف جاری جنگ میں کفار کے ساتھی بن کر حق گو علماء، فی سبیل اللہ خرچ کرنے والے اہلِ خیر اور کفار کے خلاف برسرِ پیکار مجاہدین کو پکڑ پکڑ کر دشمنوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ اس فعل کو قرآن نہ صرف حرام قرار دیتا ہے بلکہ یہاں تک کہتا ہے:

﴿ يَآيُّهَاالَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ﴾(المآئدۃ:۵۱)

''اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا ساتھی مت بناؤ۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور تم میں سے جو کوئی بھی انہیں اپنا ساتھی بنائے وہ انھی میں سے ہے''۔(مترجم))

۶۔ مسلمانوں کے علاقے میں کفار کو اپنے شعائر کے اظہار کی اجازت دینا جائز نہیں

اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدے میں کوئی ایسی بات شامل ہو جو کفار کو مسلمانوں کے علاقے میں اپنے شعائر کے اظہار کی اجازت دے۔ مثلاً، کوئی ایسا معاہدہ جو کفار کو اپنی عبادت گاہیں، مثلاً کلیسا وغیرہ تعمیر کرنے کی اجازت دے یا عیسائی مشنریوں (اور اسی قسم کی این جی اوز وغیرہ) کو مسلمانوں کے کسی بھی علاقے میں، بالخصوص جزیرۂ عرب میں گھسنے کا موقع دے، کیونکہ ان کا ہدف اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں کو فتنے میں مبتلا کریں اور ان کے عقائد کو تباہ و برباد کریں۔

شریعت کے ان اصولوں کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فلسطین (جو

درحقیقت مسلمانوں اور اسلام کی سرزمین ہے، اس) کا کوئی سیاسی حل ڈھونڈنا یا اس کے لئے کسی سے مذاکرات کرنا نہ صرف غلط ہے، بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہی ایسا باطل ہے کہ کسی بھی حیلے بہانے سے اسے درست قرار دینا ممکن نہیں۔

جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے، تو اگر چند شرائط پوری ہوں تو یہاں معاہدۂ صلح کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے:

۱۔ روس (اور اب امریکا اور یورپی وصلیبی اقوام بھی) مسلمانوں کی تمام سرزمینوں سے نکل جائیں۔

۲۔ افغانستان سے ان کے انخلاء کے بعد یہاں اسلامی امارت قائم ہو اور یہاں میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔ مثلاً نہ بادشاہ کو واپس لانے کی کوشش کی جائے نہ ہی کوئی ایسی شرائط مسلط کی جائیں جن کا مقصد اہلِ افغانستان کے عقائد بگاڑنا ہو۔

۳۔ افغانستان سے ان کا انخلاء غیر مشروط ہو۔

۴۔ یہ مجاہدین کی حیثیت باقاعدہ طور پر تسلیم کریں اور خود ان سے صلح کی درخواست کریں، (نہ کہ مسلمان ان سے صلح کی بھیک مانگیں) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الأنفال:٦١)

''اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر توکل کرو''۔

السدیؒ اور ابنِ زیدؒ فرماتے ہیں:

''اگر وہ خود تمہیں صلح کی پیشکش کریں تب تم دعوت قبول کرلو''۔

(حاشية الشرواني و ابن القاسم على تحفة المحتاج:۹/۳۰٦)

ابن حجر الھیثمیؒ فرماتے ہیں:

و الشرط الفاسد يفسد العقد الصحيح، بأن شرط فيه منع فك أسرانا، أو

ترک ما استولوا عليه أو رد مسلم أسير أفلت منهم، أو سكناهم الحجاز، أو اظهار الخمر بدارنا، أو أن نبعث اليهم من جاء نا منهم.

''صحیح رائے یہی ہے کہ کسی معاہدے میں موجود فاسد شرط اس پورے معاہدے کو ہی فاسد کر دیتی ہے۔مثلاً کوئی ایسی شرط جو:

مسلمان قیدیوں کی رہائی میں رکاوٹ بنتی ہو

یا اسلامی مقبوضات پر ان کے قبضے کو برقرار رکھتی ہو

یا کفار کی قید سے فرار ہونے والا مسلمان قیدی انھیں واپس کرتی ہو

یا کفار کو حجاز میں رہنے کی اجازت دیتی ہو

یا ہمارے علاقوں میں شراب کے پھیلنے کا ذریعہ بنتی ہو

یا کفار میں سے نکل کر ہمارے پاس آنے والے کسی بھی شخص کو واپس لوٹاتی ہو''۔

(تفسير القرطبي:۳۹/۸)

۷۔مجاہدین مطمئن ہوں کہ دشمن صلح کی پیشکش میں مخلص ہے اور دھوکہ نہیں دینا چاہتا

مجاہدین مطمئن ہوں کہ دشمن صلح کی پیشکش میں مخلص ہے اور دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔لہٰذا آج جو لوگ ''پرامن حل'' کا مطالبہ کر رہے ہیں یا کوئی ''درمیانی رستہ'' ڈھونڈنے کے خواہاں ہیں،اور محض اس لیے جہاد کے ہدف،یعنی ''اسلامی حکومت کے قیام اور شریعت کی بالادستی'' کے اعلان سے گھبراتے ہیں کہ یہ ایک ایسا ہدف ہے جو مغربی ممالک کو ناگوار گزرے گا اور وہ اس کی ہر ممکن مخالفت کریں گے.....ان لوگوں نے دراصل اس بات کو سمجھا ہی نہیں کہ اس جہاد کا حقیقی ہدف کیا ہے؟ نہ ہی یہ لوگ کسی واضح اسلامی سوچ کے حامل ہیں۔

ایسے لوگوں کو جنگ میں ساتھ رکھنا جائز نہیں!

جہاد و مجاہدین کی قیادت کرنا تو دور کی بات ہے، یہ لوگ اس قابل بھی نہیں کہ جہاد میں ایک عام سپاہی کے طور پر شریک ہوں، کیونکہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا﴾ (التوبة: ۸۳)

''پس اگر اللہ تعالیٰ تمہیں واپس ان کے درمیان لے جائے اور آئندہ پھر ان میں سے کوئی گروہ تم سے جہاد کے لیے نکلنے کی اجازت مانگے تو کہہ دینا کہ تم ہرگز میرے ساتھ نہیں نکلو گے اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی (دشمنِ دین) سے لڑو گے''۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

وهذا يدل على أن استصحاب المختل في الغزوات لا يجوز، و قد نص معظم الفقهاء في كتاب الجهاد على أنه لا يجوز أن يستصحب في الجيش مختل ولا مثبط ولا مرجف ولا مخذل ولا معوق.

''یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کسی فتنہ پرداز کو جنگ میں ساتھ رکھنا جائز نہیں۔ بیشتر فقہاء نے کتاب الجہاد میں یہ بات صراحت کے ساتھ لکھی ہے کہ کسی ایسے شخص کو اپنے لشکر میں شامل کرنا جائز نہیں جو بے وقوف ہو یا لوگوں کو جہاد سے روکتا ہو یا فتنہ و فساد پھیلاتا ہو یا ضرورت کے وقت ساتھ چھوڑ جاتا ہو یا جہاد کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا ہو''۔

(تفسير القرطبي: ۳۱۸/۸)

اے اللہ!

افغانستان، فلسطین، فلپائن، لبنان اور ہر جگہ برسرِ پیکار مجاہدین کی مدد و نصرت فرما!

اسلام کے پرچم کو سربلندی عطا فرما!

قرآن کی تابع حکومت قائم فرما!

اورہمیں اپنی راہ میں شہادت عطافرما! (آمین)

سبحان ربّک ربّ العزۃ عما یصفون و سلام علی المرسلین و الحمد للّٰہ ربّ العالمین، وصلی اللّٰہ علی نبینا محمد و علی آلہ و صحبہ و التابعین ومن تبعھم باحسان إلی یوم الدین.

باب اختتام

مسئلے کا تعلق دل سے ہے

مسئلے کا تعلق دل سے ہے

میں اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ دلائل کا ڈھیر لگا دینے یا بہت سی نصوص پیش کر دینے سے یہ مسئلہ سمجھ نہیں آتا۔ اس مسئلے کا تعلق درحقیقت دل سے ہے۔

اللہ تعالیٰ اگر دل کو نور بخش دیں تو اس نور کی روشنی میں انسان کو سب کچھ صاف نظر آتا ہے اور اسے حق پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دل ہی نور سے محروم ہو تو انسان بالکل واضح چیزیں دیکھنے میں بھی ناکام رہتا ہے:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ (الحج:۴۶)

''حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں''۔

آیاتِ الٰہی کو سمجھنے اور دلائل کو پہچاننے کے لیے دل کی آنکھیں درکار ہوتی ہیں۔ اور دل کی یہ آنکھیں اللہ کے خوف، احکامِ شریعت کی اطاعت اور عبادات میں انہماک ہی سے ملتی ہیں۔

﴿قَدْ جَآءَ كُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ﴾ (الأنعام: ۱۰۴)

''اب تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلائل پہنچ چکے ہیں، سو جو کوئی بصارت سے کام لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا اور جو شخص اندھا بنا رہے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور میں کوئی تمہارے اوپر نگران تو ہوں نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس بصیرت سے دل میں معرفت وادراک کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ وہ نعمت ہے جو نہ ہی بہت کچھ پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہیں سے خریدی جا سکتی ہے۔ یہ تو محض اللہ کا انعام ہوتا ہے کہ وہ کسی بندے کی قلبی بصیرت کے بقدر اسے اپنی کتاب اور اپنے دین کا فہم عنایت فرما دیں۔

مومن کی فراست سے ڈرو، کیونکہ وہ اللہ عز وجل کے نور سے دیکھتا ہے

یہ بصیرت دل کی زمین میں جڑیں پکڑتی ہے اور اسی کی بدولت انسان حق و باطل اور سچے و جھوٹے لوگوں میں فرق کر پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ﴾ (الحجر: ۷۵)

''یقیناً اس میں کئی نشانیاں ہیں اہلِ بصیرت کے لیے''۔

مجاہدؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں: '' لِلۡمُتَفَرِّسِیۡنَ''.

''(یعنی) فہم وفراست رکھنے والوں کے لیے''۔

ترمذی شریف میں حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِتَّقُوۡا فِرَاسَةَ الۡمُؤۡمِنِ فَاِنَّهٗ يَنۡظُرُ بِنُوۡرِ اللّٰهِ عَزَّوَ جَلَّ، ثُمَّ قَرَاَ: ﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ﴾ (الحجر: ۷۵) (ترمذي: تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم)

''مومن کی فراست سے ڈرو، کیونکہ وہ اللہ عز وجل کے نور سے دیکھتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ): یقیناً اس میں کئی نشانیاں ہیں اہلِ بصیرت کے لیے''۔

خواہشات کی پیروی کرنے والے حق کے خلاف چل پڑتے ہیں

اہلِ علم میں سے جو بھی دنیا سے محبت رکھے گا اور اسے آخرت پر ترجیح دے گا، وہ لازماً اپنے فتووں اور فیصلوں میں، اپنے خطبوں اور تحریروں میں اللہ اور اس کے دین کے بارے میں ناحق بات کہے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے احکامات اکثر اوقات لوگوں، بالخصوص اہلِ اقتدار کی خواہشات اور مفادات سے ٹکراتے ہیں۔ پس جو شخص بھی اپنی خواہشات کی پیروی کرنا چاہے اسے لازماً حق کے خلاف چلنا پڑے گا۔ اگر عالم اور حاکم خواہشات کے پیروکار اور عہدوں کے طلب گار ہوں، تو ان کے لیے حق کی مخالفت کیے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔ بالخصوص جب کسی مسئلے میں شبہات پیدا ہو جائیں، تو

یہ شبہات اور خواہشات مل کر حق کا چہرہ چھپا لیں گے اور ان کی شہوتیں انھیں کھینچ کر اسی سمت لے جائیں گی جس سے باطل راضی ہو۔

اور اگر حق بالکل نکھر کر سامنے آجائے، کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہ بچے تو یہ لوگ اپنی خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئیں گے، اور اپنے نفس کو یہ کہہ کر مطمئن کریں گے کہ: ''خیر ہے، بعد میں توبہ کرلیں گے''۔ ایسوں ہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ﴾ (مریم:۵۹)

''پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے کہ انھوں نے نماز ضائع کردی اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے''۔

اور یہ فرمانِ الٰہی بھی انھی کے بارے میں ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَ يَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا وَ اِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ وَ دَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ وَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ (الأعراف:۱۶۹)

''پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے کتابِ الٰہی کو وراثت میں پایا (مگر پھر بھی) اس حقیر دنیا کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری مغفرت ضرور ہو جائے گی، حالانکہ اگر ان کے پاس پھر ویسا ہی مال و متاع (دین فروشی کے عوض) آنے لگے تو یہ اس کو لے لیتے ہیں، کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور جو کچھ کتاب میں لکھا ہے یہ اسے خود پڑھ بھی چکے ہیں۔ اور آخرت والا گھر ان لوگوں کے لیے (اس دنیا سے) بہتر ہے جو (ان قبیح اعمال سے) پرہیز کرتے ہیں، پھر کیا تم نہیں سمجھتے''۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ پھر سنت اور بدعت میں فرق کرنا بھی ممکن نہیں رہتا، بلکہ بعض اوقات معاملہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے اور انسان کو سنت، بدعت اور بدعت، سنت دکھائی دینے لگتی ہے۔ اگر علماء دنیا کو آخرت پر ترجیح دیں، خواہشات کی پیروی کریں اور حکومتوں سے خوف کھائیں تو وہ اسی آفت کا شکار ہوتے ہیں۔ (الفوائد: ۱۱۳/۱۱۴)

درج ذیل آیات میں ایسے اہلِ علم ہی کا ذکر ہو رہا ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِىْ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾

(الأعراف: ۱۷۵-۱۷۶)

''اور (اے نبیؐ!) ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات (کا علم) عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے بھاگ نکلا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا۔ لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے''۔

حق کو پہچاننے کے لیے ایمانی بصیرت درکار ہے، جو تقویٰ سے ملتی ہے

درج بالا آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محض نصوص اور دلائل کا ہونا کافی نہیں، حق کو پہچاننے کے لیے ایمانی بصیرت بھی درکار ہے۔ اگر دنیا کی حرص سینے میں گھر کر لے، گناہوں کی کثرت سے دلوں پر زنگ چڑھ جائے اور معصیتِ الٰہی کے سیاہ نکتے پھیلتے پھیلتے پورے قلب کو

تاریک کر ڈالیں تو نور کی کوئی کرن بھی دل میں داخل نہیں ہو پاتی ۔اور جب دل سیاہ ہو جائے تو انسان چیزوں کو اپنی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتا،حق و باطل آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور حق کو پہچاننا ممکن نہیں رہتا، بلکہ حق باطل اور باطل حق دِکھنے لگتا ہے۔

انسان کو فرقان، یعنی حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت تبھی ملتی ہے، اس کا دل گناہوں کی آلودگی سے تبھی پاک ہوتا ہے اور تبھی اسے دل کے شفاف آئینے میں ہر چیز اپنی اصل صورت میں صاف اور واضح نظر آتی ہے جب وہ تقویٰ اختیار کر لے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (الأنفال: ۲۹)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو وہ تمھیں فرقان عطا کرے گا اور تمہارے گناہوں کو تم سے دور کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔

اسی لیے، اسلاف کو جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا یا وہ کسی معاملے میں الجھاؤ کا شکار ہوتے ،تو کہتے:

''چلو، محاذ والوں سے پوچھیں، کیونکہ وہی لوگ اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہیں''۔

((قَالَ الْاِمَامَانِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَاَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَغَيْرُهُمَا:'' اِذَا اخْتَلَفَ النَّاسُ فِيْ شَيْءٍ فَانْظُرُوْا مَاذَا عَلَيْهِ اَهْلُ الثَّغْرِ فَاِنَّ الْحَقَّ مَعَهُمْ؛ لِاَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (العنكبوت:۶۹)

''امام احمد بن حنبلؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور دیگر علما فرماتے ہیں کہ: جب لوگوں کے درمیان کسی بات میں اختلافِ رائے پیدا ہو جائے تو دیکھو کہ محاذوں والے کس طرف ہیں کیونکہ بے شک حق ان کے ساتھ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا ہم ضرور بالضرور ان کو اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے﴾۔ (مجموع الفتاوىٰ لابن تيمية: ۲۸/ ۴۴۲) (مترجم))

جب امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ: آپ کے بعد ہم کس سے شرعی مسائل پوچھا کریں؟ تو آپؒ نے فرمایا: ''ابوبکر الوراقؒ سے پوچھنا کیونکہ وہ صاحبِ تقویٰ ہیں اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحیح جواب دینے کی توفیق دیں گے''۔

بخاریؒ اور مسلمؒ میں یہ مرفوع حدیث روایت کی گئی ہے:

((لَقَدْ کَانَ فِیمَا قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّکُ فِیْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ))
(بخاري: كتاب المناقب: مناقب عمر بن الخطابؓ)

''تم سے پچھلی امتوں میں ''محدَث'' ہوا کرتے تھے، اور اگر میری امت میں کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمرؓ ہیں''۔

''محدَث'' سے مراد ہے وہ شخص جسے حق بات الہام کر دی جائے اور وہ اس کی زبان پر جاری ہو جائے، مگر وہ نبی نہ ہو۔

(ترمذی میں روایت کردہ ایک اور حدیث سے اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی مزید وضاحت ہوتی ہے:
((اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَ قَلْبِهٖ)) ''یقیناً اللہ نے عمرؓ کی زبان پر حق جاری کر دیا ہے اور ان کے دل میں بھی (ڈال دیا ہے)''۔ (فتح الباري شرح صحيح البخاري [illegible]))

حضرت عمرؓ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام آپؓ کے صدق و اخلاص ہی کی بدولت تھا۔

اسی طرح امام مسلمؒ اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((کَانَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّیْلِ افْتَتَحَ صَلٰوتَهٗ: اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِیْلَ وَ مِیْکَائِیْلَ وَ اِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِکَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِکَ اِنَّکَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ))
(مسلم: كتاب صلوٰة المسافرين و قصرها)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اٹھتے تو اپنی نماز کا آغاز ان کلمات سے فرماتے: اے اللہ! (اے) جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے رب! زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے! غیب اور حاضر کا علم رکھنے والے! آپ ہی اپنے بندوں کے درمیان ان معاملات کا فیصلہ کریں گے جن میں وہ آپس میں اختلاف کیا کرتے تھے! آپ ہی اس معاملے میں اپنے اذن سے حق کی طرف میری رہنمائی فرما دیجیے جس میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ بلاشبہ آپ جسے چاہتے ہیں سیدھے رستے کی طرف ہدایت دے دیتے ہیں''۔

آخر میں ہم یہ آیتِ مبارکہ بطور دعا پڑھیں گے:

﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ﴾ (الأعراف: ۸۹)

''اے ہمارے ربّ! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دیجیے اور آپ بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں''۔

اور ہم صحیح مسلم میں مذکور یہ ماثور دعا بھی پڑھیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے مانگا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ))

''اے اللہ! آپ اس معاملے میں اپنے اذن سے حق کی طرف ہماری رہنمائی فرما دیجیے جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ بلاشبہ آپ جسے چاہتے ہیں سیدھے رستے کی طرف ہدایت دے دیتے ہیں''۔

اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی کینہ نہ پیدا فرما! اے ہمارے ربّ! بے شک تو بہت شفقت فرمانے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔

اے اللہ! ہمیں سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت عطا فرما اور قیامت کے دن ہمیں سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ میں اٹھا!

سبحانک اللّٰهم و بحمدک أشهد أن لا إله إلا أنت استغفرک و أتوب إليک.

امت مسلمہ کے ماضی کی طرح اس کا مستقبل بھی ایمان واسلام کی برکات سے مالا مال، اور سعادت و شہادت کے نور سے روشن ہے! کاروانِ انبیاء کی وارث یہ امت اس کرۂ ارض پر اللہ کے دین کی محافظ و امین ہے۔ مبشرات دراصل ماضی وحال کی اس روشن داستان کو آپ کے سامنے لانے کا ایک عزم ہے۔ مبشرات کی کتب ہر اس حساس دل کے لیے ایک دستک ہیں، جو ملت کا مستقبل تابناک دیکھنے کا آرزومند ہے۔ کتب کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ کیجئے:

جنھیں جنتوں کی تلاش تھی (زیر طبع) مصنف: ڈاکٹر عبداللہ عزامؒ ترجمہ: پروفیسر خدیجہ ترابی

ڈاکٹر عبداللہ عزام شہیدؒ کے عہد ساز قلم سے، عالم اسلام کے ان شہداء کا تذکرہ جنھوں نے ۱۵ ویں صدی ہجری کے آغاز پر افغانستان کی سرزمین میں عالمی طاقتوں کی شکست وریخت کی بنیاد رکھی، ایسے ایمان افروز تذکرے کہ ہر ایک کو پڑھ کر آپ بے ساختہ پکار اٹھیں گے: ''ایسی چنگاری بھی یارب، اپنی خاکستر میں تھی!''

فلسطین ہمارا ہے! (زیر طبع) مؤلف: ڈاکٹر صلاح الخالدی

ارض مقدس کے تاریخی حقائق قرآن کی روشنی میں

ارضِ مقدس میں مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ہوئی ــــــ تب سے قیامت تک کے لیے یہ سرزمینِ مقدس دینِ ابراہیمی کے پیروکاروں کی میراث قرار پائی ــــــ پیغمبروں کی اس مقدس سرزمین فلسطین کی تاریخ اور اس پر قابض یہود کا مستقبل، قرآن کی روشنی میں ــــــ انتہائی چشم کشا حقائق

میرے ایمان کے ساتھی!

تمھارا مجھ سے وعدہ تھا (قیمت: ۱۵۰ روپے) شاعر: انجینئر احسن عزیز

ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والے مجاہد باعمل کی شاعری ــــــ ایسی بامقصد اور جھنجھوڑ ڈالنے والی شاعری جو آپ کے نہاں خانۂ دل میں دبی ایمان کی چنگاری کو شعلۂ فروزاں بنا ڈالے گی۔

اسلام اور اہلِ کتاب کی موجودہ کشمکش

بالآخر کیا ہوگا؟ (قیمت: ۶۰ روپے) مصنف: ڈاکٹر سفر بن عبدالرحمٰن الحوالی

اسرائیل وامریکہ کے مذہبی عزائم ــــــ یہود ونصاریٰ کا خود فریبی پر مبنی من گھڑت وعدہ ــــــ اسلام کا روشن مستقبل اور عالمگیر غلبہ اسلام کا سچا وعدہ ــــــ یہ وعدے کیا ہیں؟ اور بالآخر کون کامیاب ہوگا؟ نیز آج اسلام اور اہلِ کتاب کے درمیان برپا عالمگیر کشمکش میں ہمارے کرنے کے کام کیا ہیں؟ ــــــ اگر آپ جاننا چاہیں تو یہ کتاب پڑھنا مت بھولیے گا!

آخری بات

اس کتاب کی آخری بات لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، کیونکہ بات ہے ہی ایسی۔ کفر کی قومیں ہر آنے والے دن میں جس رفتار سے اسلام دشمنی میں آگے بڑھ رہی ہیں، یہ رفتار خطرے کی ساری لکیریں عبور کر چکی ہے۔ امریکا اور مغربی ممالک خصوصاً ڈنمارک، ناروے، اٹلی اور فرانس میں آئے روز توہینِ قرآن، توہینِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات جس تواتر کے ساتھ سننے اور دیکھنے میں آ رہے ہیں، تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ چالیس مغربی ممالک کے ۱۷۰ اخبارات و جرائد اور ۲۰۰ سے زائد نشریاتی چینل اہانتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتکب ہوئے! کیا یہ غیرتِ مسلم کو میٹھی نیند سلانے کی مہم کا حصہ ہے... یا مسجدِ اقصیٰ کی طرف چڑھائی کے مقدمات ہیں؟

دوسری طرف یہود و نصاریٰ کی فوجوں نے اسلام کے مرکز ارضِ حرمین اور جزیرۃ العرب میں خلیج بصرہ سے لے کر یمن کے ساحلوں تک، قطر و بحرین سے لے کر جدہ کی فضاؤں تک اور مسقط کی وادیوں سے خطہء شام کے صحراؤں تک میں اپنے پنجے گاڑھ رکھے ہیں۔ کیا ان کے یہ بحری، برّی اور فضائی اڈّے عالم اسلام پر قبضے اور اسے اپنا غلام بنا کر رکھنے کے علاوہ بھی کسی اور مقصد کے لئے ہیں؟ اور اس سارے منظر کے ساتھ عظیم تر اسرائیل کے نقشے کو اٹھا کر دیکھیں تو بات پوری طرح سمجھ آ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی بھاگ جائے گی؟ کیا مسلمانوں کے لئے اپنے اختلافات مٹا کر کفر کی اس عالمی یلغار، اور ایک ایک کر کے بلدِ اسلام پر قبضہ کرنے کی مہم کا توڑ کرنے کا وقت اب بھی نہیں آیا؟ کیا یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی للچائی ہوئی نظریں اور بڑھتے ہوئے قدم، مسلم دانشوروں اور عوام کے لئے عبرت کا کوئی سامان نہیں رکھتے؟

کاشغر و بخارا کے اجڑے ہوئے مدرسے، ہسپانیہ و بلقان کی ویران مساجد، جموں و کشمیر و دار الخلافہ بغداد کی اداس فضائیں، اور کابل و باگرام میں قرآن کے جلتے بکھرتے اوراق دنیا میں ہماری حمیت، غیرت، اور آخرت میں ہماری فلاح و نجات کے پروانے پر ایک سوالیہ نشان ضرور لگاتے ہیں! کیا ہم نے کبھی اس بات پر غور کیا؟

محمد صہیب قرنی

مبشرات اسلام آباد

اہم ترین فرضِ عین

"...... جہاد اس وقت تک فرضِ عین کی حیثیت سے برقرار رہے گا جب تک ہم اُس آخری بقعہء زمین کو بھی آزاد نہ کرالیں جو کبھی ایک دن بھی اسلام کے زیرِ سایہ رہا ہو۔ پس جہاد ہم سب پر فرضِ عین ہے جب تک ہم فلسطین، بخارا، تاشقند، اندلس، سائبیریا، آدھا فرانس (اور دیگر تمام مقبوضات) واپس نہ چھین لیں۔ اور اسی طرح ہر وہ بقعہء زمین جس پر کسی بھی زمانے میں، چاہے ایک دن بھی اسلام کی حکمرانی رہی ہو ...... جب تک ہم اسے دوبارہ کفار سے چھڑا نہ لیں، جہاد ہر مسلمان پر تعین کے ساتھ فرض رہے گا...... اور جہاں تک جہاد بالمال کا تعلق ہے، تو جب تک جہاد کو مال کی ضرورت رہے، یہ بدرجہء اولیٰ فرضِ عین رہے گا......"

امام عبداللہ عزام شہید ؒ

سائبیریا
نصف فرانس
بوسنیا
جنوبی یورپ
اندلس
قرطبہ
پرتگال
بلغاریہ
قسطنطنیہ
یونان
قبرص
شیشان
بغداد
فلسطین
بخارا
کاشغر
کابل
کشمیر
سنکیانگ
دہلی
اراکان
ایتھوپیا
سولو

مبشرات